قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ———

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مدیرِ مسئول : مرزا محمد خلیل

معاونین : ثریا عندلیب

محمد عمر دراز

ناشر : شیخ عبدالحمید

طابع : خالد منصور نسیم

مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۴ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۱ ——— اکتوبر ۱۹۸۸ء ——— شمارہ ۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۶۰ روپے

بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے

فی پرچہ : -/۵ روپے

فہرست

۱۔ لمعات : ۲

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔

۲۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور راشٹرپتی ابوالکلام آزاد ۱۲

۳۔ حسنِ تحریر۔ محترم پرویزؒ صاحب ۴۰

۴۔ حکمرانی اور قانون سازی کا حق کس کو حاصل ہے؟ ۵۴

محترم محمد اسلام۔

۵۔ حقائق و عبر :۔ ۶۹

(i) فرقۂ اہلحدیث اور درود کی صحیح عبارت۔

(ii) عوام کی دین سے بے رغبتی ۔

(iii) علماء کے بارے میں عوام کیا سوچتے ہیں؟

۶۔ نقد و نظر۔ قبلۂ اوّل ۷۴

۷۔ سرسید احمد خان بحیثیت ایجوکیشنسٹ (انگریزی) ۸۰

محترمہ شمیم انور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بسلسلۂ عید میلاد النبیؐ

لمعات

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں دوسرا بیٹا قیدار نہایت نامور ہوا ہے۔ یہ حجاز میں آباد ہوا اور خدا کے اُس پہلے گھر (خانہ کعبہ) کی تولیت کا مقدس فریضہ اس کے حصہ میں آیا جو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔

قریش، قیدار کے بیٹے فہر کا لقب تھا۔ عربی لغت میں قریش کے متعدد معانی آئے ہیں۔ ویل مچھلی کو بھی قریش کہتے ہیں۔ اس لئے اکثر قیاس کا رُخ اس طرف گیا ہے کہ فہر نے اپنی قوت اور عظمت کے اظہار کے لئے یہ لقب اختیار کیا تھا۔ قریش میں قصی ابن کلاب ایک خصوصی شہرت کا مالک ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس قبیلہ میں ایک سیاسی نظام قائم کیا۔ اس نے ایک طرف کعبہ کے انتظام کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا۔ مثلاً سقایہ (حجاج کے کھانے پینے کا انتظام)، عمارہ (خانہ کعبہ کی دیکھ بھال)، افادہ (حاجیوں کی مالی اعانت کا کام) وغیرہ اور دوسری طرف سیاسی امور کی انجام دہی کے لئے ندوۃ (عدالت کا کام) اور مشورہ (مشاورت گاہ) جیسے شعبے قائم کئے۔ قصی ابن کلاب کے بعد، قریش میں ہاشم کو خاص شہرت حاصل ہوئی یہ بھی بڑا نامور سردار تھا جس نے تولیتِ کعبہ کے سلسلہ میں اپنے فرائض کو نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ اس نے قیصرِ روم اور حبش کے بادشاہ نجاشی سے فرامین حاصل کئے کہ تجارِ قریش کے قافلے جب ان کے حدودِ سلطنت میں داخل ہوں تو اُن سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔

ہاشم کا بیٹا عبدالمطلب بھی، اپنے قبیلہ کا نامور سردار تھا۔ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چاہِ زمزم کا (جو ایک مدت سے اَٹ کر گم ہو چکا تھا) سراغ لگایا اور کھُدوا کر نئے سرے سے آباد کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی قبیلۂ زہرہ میں، وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو قریش کے گھرانے میں ممتاز تھیں۔

اسی محترم اور ممتاز گھرانے میں، موسم بہار میں، دوشنبہ کے روز، بتاریخ ۹ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل

بوقتِ صبح اُس نیّرِ عالمتابؐ کا طلوع ہوا جس سے دُنیا بھر کی تاریکیوں کو کافور ہو جانا تھا۔
(معراجِ انسانیت ص۷۸-۷۷، تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء)

لیکن اس آفتابِ عالمتابؐ کے اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھ کھولنے سے پہلے ہی والدِ ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا، لہٰذا دادا نے اپنے مرحوم لختِ جگر کی یادگار کو اپنی گود لیا اور خانہ کعبہ میں جا کر دعا مانگی۔ ساتویں دن تمام قبیلہ کی دعوت کی اور بچہ کا نام محمدؐ رکھا۔ لوگوں نے ازراہِ استعجاب پوچھا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا؟ کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ دُنیا بھر کی ستائش اور تعریف کا شایان قرار پائے۔ یہ اسمِ گرامی دادا کی طرف سے تجویز ہوا لیکن والدہ نے نام احمدؐ رکھا۔ حضورؐ کی عمر ابھی قریب چھ برس کی تھی کہ آپؐ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا اور آپؐ کی کفالت آپ کے دادا نے اپنے ذمہ لی۔

اور یوں، دنیا بھر کی سرداریوں کا سزاوار یہ سراجِ منیرؐ، اس دنیا کے معیاروں کے مطابق یتیم ہو گیا۔ والدِ ماجد، آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اور والدہ محترمہ، حضورؐ کو چھ برس کی عمر میں — داغِ مفارقت دے گئیں۔ یہ تھا وہ دُرِّ یتیمؐ، جس کی یتیمی کا ذکر اللہ جلّ شانہٗ، قرآنِ کریم میں یوں فرماتے ہیں:-

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ (۹۳/۶)

"ہم نے آپ کو یتیم (بے سہارا) پا کر، پناہ دی"

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ خود اس یتیمؐ کو پناہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:-

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝ (۹۳/۸)

"آپ کو ضرورت مند پایا تو اتنا کچھ دیا کہ جس سے آپ کسی کی مدد کے محتاج نہ رہے"

آیئے دیکھیں کہ ایسے یتیموں کی پرورش کی ذمہ داریوں کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا احکام دیئے ہیں۔ سب سے پہلے اُس مالکِ حقیقی نے یہ کہا کہ:-

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (۹۳/۹)

"تو جو یتیم (بے سہارا، تنہا، بے یار و مددگار) رہ جائے اس کو مت دھتکاریئے"

پھر ارشاد ہوا کہ (غلط نظامِ زندگی پر چل کر تباہ ہونے والو! خدا نے تمہیں یونہی ذلیل و خوار اور تباہ و برباد نہیں کر دیا) ہرگز نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا نظامِ حیات، یتیموں (بے سہارا رہ جانے والوں) کی عزت و توقیر نہیں کرتا تھا:"

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ۝ (۸۹/۱۷)

اس نے کہا کہ دین پر عمل پیرا ہونے کے دعوے دارو! آؤ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم کس طرح ان دعووں کے باوجود، دین کے عطا فرمودہ نظام کو جھٹلاتے ہو۔ تم پردہ کام کرتے ہو جو لوگوں کو نظر آئیں اور ان کی بنا پر تم واجب الاحترام بن جاؤ لیکن درحقیقت تم یہ کرتے ہو کہ:۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ (۱۰۷/۲)

"یتیم (اکیلا، بے یار و مددگار رہ جانے والے) کو دھکے مار مار کر اپنے سے دُور کرتے ہو"

اور بھوکا رہ جانے والے کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے:۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (۱۰۷/۳)

"اور مسکین کو کھانا دینے کی رغبت نہیں دلاتے"

یاد رکھو! جو ایسا کرتا ہے اور دکھاوے کے کاموں کو محض نمائش کی خاطر بڑھ چڑھ کر انجام دیتا ہے، دین سمجھتا ہے، اُن کے لئے تباہی ہے:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ (۱۰۷/۴-۶)

"تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کے مقصد ہی سے غافل ہیں لیکن اس کے محسوس ارکان (قیام، رکوع، سجود وغیرہ، جو لوگوں کو نظر آئیں) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضۂ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے (۵/۹۴)"

ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسری طرف:۔

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (۱۰۷/۷)

"رزق کے اُن سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہیئے، بند لگا کر، ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں"

اس نے کہا کہ تم نے ایسا نظامِ معاشرہ وضع کر رکھا ہے کہ تمام تر طبیعی قربتوں کے باوجود وہ یتیم، اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہے:۔

يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ (۹۰/۱۵)

ربِّ کریم نے، یتیموں کا مال کھا جانے والوں کو یہ کہہ کر تنبیہ کر دی کہ وہ اپنے تئیں یہ نہ سمجھیں کہ اپنی صنعت کاریوں اور حیلہ جوئیوں سے، انہیں خیرِ کثیر مل جاتا ہے بلکہ وہ درحقیقت اپنے پیٹوں کو آگ سے بھر رہے ہیں:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝ (۴/۱۰)

"یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں (جس سے اُن کے جذباتِ حرص و ہوس اور بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کی نیت بھرتی ہی نہیں اور وہ جائز اور ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں) اس سے اُن کی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ:-

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ ؕ ..... ۝ (۴/۱۲۷)

"یتیموں کے ساتھ انصاف و انصاف کرو۔"

اور ساتھ ہی یہ کہہ کر اس کی حکمت سمجھا دی کہ:-

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِهٖ عَلِیْمًا ۝ (۴/۲۷)

"جو بھلائی تم ان کے ساتھ کرو گے (وہ رائیگاں نہیں جائے گی) اللہ تمہارے ہر عمل کا علم رکھتا ہے۔"

یہاں تک کہ اُس ربّ العالمین نے صرف یہی نہیں کہا کہ یتیموں کو ان کا حق، انصاف و احسان سے ادا کرو، بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ مالِ غنیمت میں سے بھی یتیموں کو حصہ دو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی ..... ۝ (۸/۴۱)

"اس بات کو جان لو کہ جو شے تمہیں بطور غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا ہے اور اس میں سے قرابت داروں کا اور یتیموں کا بھی حصہ ہے۔"

یہ ہیں ارشاداتِ ربّانی یتیموں کی پرورش کے بارے میں، لیکن ہمارے حنفی فقہاء ایسے یتیم کو محروم الارث قرار دیتے ہیں اور اُسے اُس ظالم دنیا میں، تن تنہا اور بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں جس میں جہدِ للبقاء کی خاطر بڑے بڑے طاقتور اور اصحابِ دولت، بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے اپنے سے کمزور انسانوں کے حقوق غصب کرنے کے لئے ہر وقت آمادۂ پیکار رہتے ہیں۔

یا للعجب! ہے ناقابلِ صد تحسین اور لائقِ ہزار ستائش، ان فقہا کا یہ فیصلہ کہ ایسے یتیم کو، جس کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے دادا کی موت تک اپنے باپ کو زندہ نہ رکھ سکا، ہر اس سہولت اور وسیلہ سے محروم کر دیا جائے جو اُسے اپنے باپ کے وسائل سے محرومی کے بعد، دادا کے ترکہ سے مل سکتے تھے اور

جس ظلم کے سدباب کے لئے، اللہ تعالیٰ نے خود ذاتِ رسالتمآبؐ کو یاد دلا کر کہ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی اور وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی یہ حکم دیا تھا کہ:-

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (۹۳/۹)

"بے سہارا رہ جانے والے (یتیم) کو کبھی نہ دھتکاریئے (اور ایسا معاشرہ قائم کرنے کے لئے ثبات و استقلال کے ساتھ جدّ و جہد جاری رکھئے جس میں بے یار و مددگار، تنہا رہ جانے والوں کو، کوئی نہ تو دبا سکے اور نہ ہی دھتکار سکے)"

اور یہی ہیں وہ جو اس رسولِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یتیمی کے صدقے خدا کے عطا فرمودہ ضابطۂ زندگی (قرآنِ حکیم) پر ایمان رکھنے کے مدعی اور اپنے آپ کو بحمداللہ مسلمان کہنے والے علماء اور فقہا، جو خدا کے ان احکام کو اس طرح اپنی خود ساختہ صنعت کاریوں سے دنیا تراش کرتے ہیں کہ آپؐ جیسے یتیم، محروم الارث، کر دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ اس جہانِ پُر آشوب میں زندہ نہ رہ سکیں۔

اس کے بعد آیئے دیکھیں کہ ترکہ کی تقسیم کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے کیا احکام دیئے ہیں!

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر اس مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس میں نہ کوئی پیچیدگی رہتی ہے نہ ابہام۔ ساری پیچیدگیاں اور اُلجھنیں فقہی قوانین کی پیدا کردہ ہیں لہٰذا ان اشکال اور اختلافات کے ذمہ دار ہم خود ہیں نہ کہ خدا کی کتاب!

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُرد و صاف ۔۔۔ رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے۔

یہ احکام سورۃ نساء کی آیات ۷ تا ۱۴، ۳۳ اور ۱۷۷ میں آئے ہیں:-

قرآنِ مجید میں قانونِ وراثت کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے:-

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ..... (۴/۷)

اقربون جن میں والدین بھی شامل ہیں، جو کچھ چھوڑ کر فوت ہوں (اس کی تقسیم یوں ہوگی)۔ دوسری آیت یہ ہے۔

یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ ..... (۴/۱۱)

اولاد میں ترکہ کی تقسیم کے متعلق یہ حکم ہے:-

ان آیات میں والدین۔ اولاد اور اقربون کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ہماری زبان میں والدین سے مُراد صرف ماں باپ ہوتے ہیں اور اولاد سے مراد بیٹے بیٹیاں۔ لیکن عربی زبان میں ماں باپ اور اُن سے اُوپر تک (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں اور اولاد میں بیٹے بیٹیاں اور ان سے نیچے تک (پوتے پڑپوتے وغیرہ) سب۔ اس

حقیقت کو اہلِ فقہ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اختلاف اقربون کے مفہوم میں ہے۔

قرآن کریم نے والدین کے ساتھ جو اقربون کا اضافہ کیا ہے تو اس میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے

مثال ۱

زید
بکر
عمر
حمید
رشید

اس میں بکر سے لے کر رشید تک سب زید کی اولاد میں شامل ہیں اور حمید سے لے کر زید تک سب رشید کے والدین میں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے زید کی وفات پر بکر سے لے کر رشید تک سب اس کے وارث قرار پا جائیں گے اور رشید کی وفات پر حمید سے لے کر زید تک۔ لیکن اس سے بڑی اُلجھنیں پیدا ہو جاتیں۔ قرآن مجید نے اقرب کا اضافہ کر کے معاملہ صاف کر دیا۔ لیکن جس لفظ نے قرآنی منشاء کو اس قدر واضح کر دیا تھا فقہ نے اسی سے سارے معاملہ کو اُلجھا دیا۔ اقربون کا عام ترجمہ رشتہ دار یا قریبی رشتہ دار" کیا جاتا ہے۔ اس ترجمہ یا مفہوم کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دُور کا رشتہ دار وارث نہیں ہو سکتا۔ اقربون کے اسی مفہوم کی رُو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم قرار دیا جاتا ہے۔ بات ذیل کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔

مثال ۲

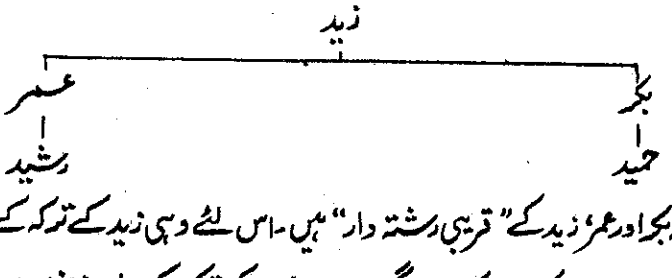

اہلِ فقہ کا کہنا ہے کہ بکر اور عمر زید کے "قریبی رشتہ دار" ہیں۔ اس لئے وہی زید کے ترکہ کے وارث ہوں گے۔ حمید اور رشید "دُور کے رشتہ دار" ہیں۔ (بکر اور عمر کی موجودگی میں) وہ زید کے ترکہ کے وارث نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک بات ٹھیک ہے کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، یہ اقرب کے قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ زید کی زندگی میں بکر وفات پا جاتا ہے۔ اہلِ فقہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں عمر جو زید کا قریبی رشتہ دار ہے وہ اس کے کل ترکہ کا وارث ہوگا اور حمید جو زید کا دور کا رشتہ دار ہے وہ اس کے ترکہ سے محروم ہو جائے گا۔ یتیم پوتے کی محرومی کی ساری عمارت اس فقہی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

(۳) اقرب (جمع اقربون) کا مندرجہ بالا مفہوم صحیح نہیں۔ "اقرب" کا لفظی ترجمہ "قریب تر" ہے۔ "رشتہ دار" نہیں۔

رشتے داروں کے لئے قرآن مجید میں ذی القربیٰ وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ "اقربٰ" قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھئے کہ قرآنِ مجید نے یہ نہیں کہا کہ ترکہ "اقربون" کو ملے گا۔ اس نے کہا ہے کہ جو کچھ اقربون چھوڑ جائیں وہ اُن کے وُرثاء میں تقسیم ہو۔ یعنی اقرب کا لفظ متوفّی کے لئے آیا ہے، وارث کے لئے نہیں۔ بظاہر ان دونوں میں کچھ فرق نظر نہیں آتا لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان میں بڑا اہم فرق ہے۔ اقرب کے معنے ہیں وہ متوفّی جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔ مثال ۲ کو سامنے لائیے۔ زید، بکر اور عمر دونوں کا اقرب ہے کیونکہ اس کے اور اس کے ان بیٹوں کے درمیان کوئی اور وارث حائل نہیں۔ لیکن وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں کیونکہ اس کے اور ان دونوں کے درمیان بکر اور عمر روک بن کر کھڑے ہیں۔ یعنی زید اور حمید کے درمیان بکر اور زید اور رشید کے درمیان عمر۔ لہٰذا، بکر اور عمر کی موجودگی میں وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا۔ وہ بے شک حمید اور رشید کا "والد" ہے لیکن ان کا اقرب نہیں۔ اس سے مثال ۱ کی حکمتِ بالغہ واضح ہو جائے گی۔

لیکن اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو وہ حمید کا اقرب ہو جائے گا کیونکہ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی جس کی وجہ سے وہ حمید کا اقرب نہیں تھا۔ البتّٰہ وہ رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اور رشید کے درمیان عمر کی رکاوٹ موجود ہے۔ لہٰذا، زید کی وفات پر رشید تو اس کے ترکہ سے محروم رہے گا، حمید نہیں۔

اب آپ سوچئے کہ جب قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ اقرب جو کچھ چھوڑ کر مریں اُن کے ترکہ کی وارث ان کی اولاد ہو گی تو حمید کو، جو زید کی اولاد بلا رکاوٹ ہے، زید کی وراثت سے محروم کر دینا قرآنِ مجید کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو کیا ہے؛ فقہ کا فیصلہ ہے کہ عمر جس طرح رشید کے راستے میں رکاوٹ ہے اسی طرح حمید (یتیم) کے راستے میں بھی رکاوٹ ہے۔ سوچئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بکر کی زندگی میں زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر تھا، نہ کہ عمر تو بکر کے مرنے کے بعد عمر، حمید کی رکاوٹ کیسے بن گیا؟ ذیل کی مثال کی دو لائنوں پر غور کیجئے۔

مثال ۳

زید — اور — زید
بکر — — عمر
حمید — — رشید

} یہ دونوں لائنیں الگ الگ ہیں۔ بکر حمید کی رکاوٹ ہے اور عمر رشید کی۔ حمید کی رکاوٹ بکر کے مرنے سے دُور ہو گی اور رشید کی عمر کے مرنے سے۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ فقہ بھی اسے تسلیم کرتی ہے کہ زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر ہے، عمر نہیں۔ اگر زید اور بکر کی زندگی میں حمید فوت ہو جائے تو اس کا وارث بکر ہوتا ہے۔ زید نہیں۔ لیکن اگر بکر، حمید سے پہلے فوت ہو جائے تو پھر فقہ، زید کو حمید کا وارث تسلیم کر لیتی ہے خواہ عمر زندہ

ہی ہو۔ یعنی اس صورت میں عمر، زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بالفاظِ دیگر، ہماری فقہ کی رُو سے یتیم پوتا تو دادا کی وراثت سے محروم قرار پاجاتا ہے لیکن دادا اپنے یتیم پوتے کی وراثت سے محروم نہیں قرار پاتا۔ یہ بات آپ کو عجیب سی لگے گی۔ لیکن عجیب ہو یا غریب ہے یہ واقعہ۔ فقہ کا یہی فیصلہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ فقہ خود تسلیم کرتی ہے کہ اقرب کے معنے "قریبی رشتے" نہیں بلکہ وہ متوفّی ہے جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔

(۴) فقہ کے فیصلے کی رُو سے جو اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ زید اور اس کے دونوں بیٹے (بکر اور عمر) ایک جگہ کھڑے ہیں۔ کچھ ڈاکو زید پر حملہ کرتے ہیں۔ عمر اپنے باپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ بکر اسے بچانے کے لئے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتا ہے۔ گولی اُسے بھی لگتی ہے اور زید کو بھی۔ بکر وہیں موقع پر مر جاتا ہے اور زید ہسپتال جاکر کچھ وقت بعد دم توڑ دیتا ہے۔ فقہ کے فیصلے کی رُو سے بکر کی یتیم اولاد زید کے ترکہ سے محروم رہ جائے گی اور عمر جو باپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ باپ کے سارے ترکہ کا وارث بن جائے گا۔

جب زید اور بکر کو گولی لگی تھی، اگر زید پہلے مرجاتا اور اس کے دو منٹ بعد بکر فوت ہو جاتا تو حمید کو زید کے ترکہ سے حصّہ مل جاتا۔ لیکن اگر بکر زید سے دو منٹ پہلے مرجائے تو پھر حمید کو کچھ نہیں مل سکتا۔

(۵) اہلِ فقہ کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ پوتا اپنے باپ کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے۔ جب بکر کو اپنے باپ سے پہلے مرجانے پر باپ کے ترکہ سے کچھ ملا ہی نہیں تو حمید کون سے ترکہ کا وارث ہو جائے گا؟ ان سے پوچھئے کہ اگر دلیل یہی ہے تو اگر بکر اور عمر زید سے پہلے مرجائیں تو زید کے مرنے پر حمید اور رشید کو اس کے ترکے کا وارث کیسے بنایا جاسکتا ہے کیونکہ اُنہوں نے تو اپنے باپوں کا ترکہ لینا تھا۔ جب ان کے باپوں نے زید کا کوئی ترکہ ہی نہیں پایا تھا تو ان کے بیٹوں کو زید کا ترکہ کیسے مل جائے گا؟ لیکن فقہ خود اپنی دلیل کے خلاف اُنہیں ترکہ دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ حمید اپنے باپ کے مرنے پر باپ کی جگہ آجاتا ہے اسی طرح رشید اپنے باپ کے مرنے پر اس کی جگہ۔ اس وقت یہ زید کے "پوتے" نہیں رہتے۔ "اولاد" میں شامل ہونے کی جہت سے اس کے "بیٹے" بن جاتے ہیں۔ یعنی زید کے بیٹوں کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ یتیم پوتا اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔

مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ یہ حضرات اپنے مؤقف کی تائید میں کون سی سند پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی سُن لیجئے۔ یتیم

تے کو دادا کی وراثت سے محروم قرار دینے میں مودودی (مرحوم) پیش پیش تھے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ اس کے لئے
مد کیا ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا :۔

فقہاءِ اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بناء قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہاءِ امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی مائے دینا مشکل ہے۔ (رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ایڈیشن سوم صفحہ ۲۰۹)

یعنی انہیں اپنے مؤقف کی تائید میں نہ قرآن کریم سے کوئی حکم ملا نہ حدیث سے لیکن چونکہ اسلاف سے یہ مسلک متواتر چلا رہا ہے اس لئے اتباع اسی کا کرنا چاہیے۔ یہ وہی دلیل ہے جسے قرآن کریم متعدد مقامات پر یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ اِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ آبَآءَنَا (۳۱/۲۱) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جو ہمارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے"۔

ما انزل اللہ، کے اتباع کی دعوت طلوعِ اسلام نے دی تھی۔ ان کے متعلق مودودی (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ

یہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اُپچ کی بات نکالا کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری اُمت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟

(ترجمان القرآن بابت جون۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

لم اور دین کی بارگاہ سے اس قسم کے جوابات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جب ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ جب تک یتیم پوتوں کا دادا زندہ تھا وہ اُن کی پرورش کا ذمہ دار تھا کیونکہ اس کی جائداد اس کے اپنے قبضے میں تھی اُس کے مرنے کے بعد یہ جائداد یتیموں کے چچا کے پاس چلی جائے گی اور انہیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا تو یہ بے سہارا رہ جائیں گے۔ ان کی پرورش کا کیا انتظام ہوگا۔ تو اس کے جواب میں اُنہوں نے فرمایا کہ

شریعت کی رُو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کا انتظام کریں۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۰)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ دادا اُن کے حق میں کچھ وصیت بھی کر سکتا ہے۔ یعنی پہلے تو انہیں اس حق سے محروم کر دیا جو انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اور پھر ان کے چچا کو ترغیب دلائی کہ وہ ان بے سہارا یتیموں کی طرف (جن کے حصے کو وہ ہڑپ کر چکے ہیں) بھیک کے کچھ ٹکڑے پھینک دیا کریں (یتیموں کی جس طرح پرورش ہوا کرتی ہے اس کا کسے علم نہیں)۔ اس سے ہمیں یہودیوں کی وہ ذہنیت یاد آگئی جسے قرآن کریم نے ہماری عبرت آموزی کے لئے بیان کیا ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اپنے ہاں کے غریب اور بے سہارا لوگوں کو بستیوں سے نکال دیتے اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر قیدی بنا لیتے تو یہ ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے آپس میں چندے اکٹھے کرتے کیونکہ ان کے نزدیک قیدیوں کو رہا کرانا بڑے ثواب کا کام تھا۔ قرآن کریم نے اس پر ان کی سخت سرزنش کی ہے اور کہا ہے کہ اس "ثواب کمانے" کی خاطر تم جو پہلے جرم کرتے ہو تمہیں اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں؟ اور کیا تمہارا یہ (بزعم خویش) ثواب کا کام اس کا کفارہ بن سکتا ہے؟ اس کے بعد کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے سے کفر برتتے ہو"۔ یاد رکھو: فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا کہ دنیاوی زندگی میں تم ذلیل و خوار ہو اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا"۔

یتیم پوتوں کے سلسلے میں ہم یہی روش اختیار کرتے ہیں۔ پہلے انہیں اُن کے حق سے محروم کر دیتے ہیں اور پھر ان کے اپنی رشتے داروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کر کے ثواب کمائیں نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

(مطالب الفرقان جلد چہارم ص۲۹۴-۲۸۹ نومبر ۱۹۷۷ء ایڈیشن)

خدا خدا کر کے ۱۹۶۱ء میں حکومت کی طرف سے عائلی قوانین نافذ ہوئے تو کم از کم پاکستان کی حدود میں اُس ظلم اور بے انصافی کا سدِباب ہو گیا جو ہمارے فقہاء صدیوں سے یتیم پوتے پوتیوں سے کرتے چلے آرہے تھے۔ ہمارے علماء اُس وقت سے لے کر آج تک، ان قوانین کو بالعموم اور یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق شق کو بالخصوص منسوخ کرانے کی کوششیں کرتے چلے آرہے ہیں۔

ہم اپنے یہ لمعات، اُس دُرِیتیم کے حضور اس عرضداشت کیساتھ پیش کرتے ہیں کہ یارحمۃ للعالمینؐ دیکھ لیجئے! آپ کی اُمت کے یہ مزعومہ علماء اور فقہاء، کس طرح آپ جیسے یتیموں سے زندگی کا حق چھیننے کی تگ و دو میں مصروف ہیں اور انہیں خدا کے اُس حکم کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں جو اُس نے آپؐ کو مخاطب کر کے تمام بنی نوع انسان کو دیا تھا کہ:-

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ ۝

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح —— اور —— راشٹرپتی ابوالکلام آزاد

(محررہ مارچ ۱۹۷۴ء)

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، ہماری سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ابھی تک تحریک پاکستان کی کوئی ایسی قابلِ اعتماد تاریخ شائع نہیں ہوئی جس میں اس تحریک کی اساس اور مطالبۂ پاکستان کے محرکات سے بحث کی گئی ہو۔ اس قسم کی تاریخ کے لئے بنیادی مسالہ طلوعِ اسلام (دورِ اوّل) کے فائلوں سے ملے گا۔ اس میں آپ کو نظر آئے گا کہ اس بحث کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ مسلم لیگ (قائداعظم) کا دعوٰے یہ تھا کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ، منفرد قومیت کے افراد ہیں اور غیر مسلم ان سے الگ قومیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس، کانگرس کا دعوٰی یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندے، وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک (متحدہ) قومیت کے افراد ہیں۔ قائدِ اعظم اس نظریہ کی تبلیغ ۱۹۳۷ء سے کرتے چلے آرہے تھے اور کانگریس کی طرف سے ان کی مخالفت بھی پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ جب قائدِ اعظمؒ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ذہن اس نظریہ کے متعلق صاف اور پختہ ہوگیا ہے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی بنا پر، مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کا باضابطہ اعلان کر دینا چاہیئے۔ اس کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ قرارداد منظور ہوئی جو مملکتِ پاکستان کی اساس قرار پائی۔ اس کانفرس اور اس میں قائداعظمؒ کے خطبۂ صدارت کا تذکرہ تو ہمارے ہاں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت کس انداز سے ہوئی تھی۔ انہوں نے محسوس کرلیا کہ اس کانفرس کی روئداد سے ساری دنیا کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ ایک الگ قومیت اور اس بنا پر ایک الگ مملکت کا مطالبہ، مسلمانانِ ہند کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہی دنوں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس منعقد کیا جائے اور اس کا صدر (راشٹرپتی) کسی مسلمان کو بنایا جائے جو اپنے خطبۂ صدارت میں اس نظریہ کی مخالفت کرے۔ اس کے لئے قرعۂ فال (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نام پڑا جو ایک ممتاز عالمِ دین کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ یہ اجلاس رام گڑھ میں منعقد ہوا۔ لاہور کانفرس میں قائدِ اعظمؒ کا خطبۂ صدارت جہاں اس اعتبار سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، کہ اس میں اسلام کے اس بنیادی تصوّر کو دہرایا کہ معیارِ قومیت دین کا اشتراک ہے نہ کہ

وطن کا) نکھار اور اُبھار کر دنیا کے سامنے لایا گیا۔ اس کے مدِمقابل، مولانا آزاد (مرحوم) کا خطبۂ صدارت اس جہت سے اہم ہے کہ ہندو نے اسلام کے اس بنیادی نظریہ کی مخالفت کس انداز سے کرائی تھی (قائدِاعظمؒ کا وہ خطبہ تو ہمارے ریکارڈ میں موجود ہے۔ لیکن مولانا آزاد کے اس خطبہ کا شاید کسی کو علم بھی نہ ہو۔ طلوعِ اسلام نے اپنی اپریل ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں جہاں مسلم لیگ کانفرنس کی روئداد شائع کی تھی، وہاں اپنے تبصرہ کے ساتھ مولانا آزاد کے خطبہ کے متعلقہ حصے بھی شائع کئے تھے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ۲۳ مارچ (یوم پاکستان) کی تقریب کی نسبت سے اس تبصرہ کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ تحریک پاکستان کی مخالفت کس کس گوشے اور کس کس انداز سے ہوتی تھی۔ مولانا آزاد (مرحوم) کے خطبۂ صدارت پر طلوعِ اسلام کا تبصرہ حسب ذیل تھا۔

نظر بر
خطبۂ صدارت
راشٹرپتی مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر ترا شد

جیسا کہ ہم نے اشاعتِ سابقہ میں عرض کیا تھا، مولانا آزاد صاحب کے انتخابِ صدارت سے ہمیں ایک خوشی ضرور ہوئی تھی اور وہ یہ کہ اب خدا خدا کر کے وہ صبر آزما سکوت ٹوٹے گا جس نے بیس سال سے یہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ:-

دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

چنانچہ لاہور کی تقریر کے بعد کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کی تقریب پر مولانا صاحب کو خطبۂ صدارت سنانا پڑا جس میں ان سے وہ کچھ کہلوایا گیا جس کے کہنے سے وہ اتنا عرصہ پہلوتہی کرتے چلے آرہے تھے۔ ہم کانگریس کے اربابِ بست و کشاد کے رہینِ کرم ہیں کہ انہوں نے حضرت مولانا کو یہ اعزاز عطا فرما کر "سادگی و پرکاری" کے ان حسین و جمیل نظر فریب پردوں کو اُٹھا دیا جن میں مولانا صاحب مُدّت سے چھپے بیٹھے تھے اور جس کی مرصّع کاریوں کی بنا پر بہت سے ابلہ فریب حضرات بیچارے سادہ لوح مسلمانوں کو دامِ تزویر میں پھنسا لیا

کرتے تھے۔ اب حقیقت بے نقاب ہو گئی اور کسی کو یہ کہہ کر دجل و تلبیس کا موقع نہ ملا کہ "ہاں، حضرت مولانا نے بھی ہم سے تخلیہ کی گفتگو میں یہی فرمایا ہے کہ "میرا عقیدہ بھی وہی ہے جو جمہور مسلمانوں کا ہے" اب پردے اُٹھ گئے۔ اب مولانا صاحب کے خیالات کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیا یہ کانگریس کے اربابِ حل و عقد کا کچھ کم احسان ہے؟

اس خطبہ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے۔ آپ کو اللہ اور اس کے رسول کا نام کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ وہ مولانا آزاد کہ جن کی "عہدِ اسلامی" میں یہ حالت تھی کہ ہر دوسرے فقرے کے بعد آیتِ قرآنی اور تیسرے جملہ کے بعد کوئی حدیثِ مقدس آجاتی تھی، آج ان کی یہ حالت ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں، جھجکتے ہیں۔ اور تو اور خطبۂ صدارت کی ابتداء میں بسم اللہ تک بھی نہیں لکھی گئی۔

انقلابات ہیں زمانے کے

کہہ دیا جائے گا کہ یہ خطبہ چونکہ مختلف مذاہب و ملل کے لوگوں کے اجتماع میں پیش کیا جانا تھا۔ اس لئے اس میں قرآن و حدیث کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی اس امر کی حاجت کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے کیا جائے کیونکہ اس مجمع میں بہت سے ایسے سامعین بھی موجود تھے جو سرے سے خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں ——— بجا اور درست! یہی تو ہم کہتے ہیں کہ جب ایک مسلمان کو متحدہ قومیت کا چولہ پہننا پڑتا ہے تو اُسے اپنے اسلامی مقام سے ہٹنا ضرور پڑتا ہے۔ اور مسلمان جب اپنے اصلی مقام سے ہٹا تو پھر دنیا وی اصطلاح میں وہ جو کچھ بھی کیوں نہ بن جائے مسلمان باقی نہیں رہتا۔ مسلمان رہے تو اور کچھ نہیں تو آغازِ کلام تو اللہ کے نام سے کر دے۔

ہم اشاعتِ طلوعِ اسلام کی اس دو سالہ مدت میں متعدد مقامات پر مولانا آزاد کے دورِ الہلال کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کر کے بتا چکے ہیں کہ ان کا موجودہ مسلک خود انہی کے سابقہ دور کے الفاظ میں کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔ اگر ان تمام اقتباسات کو یکجا کر دیا جائے جو ہم اس ضمن میں متفرق طور پر پیش کرتے رہے ہیں تو وہ ایک ایسا مصفّٰی آئینہ بن سکتا ہے جس میں حضرت مولانا کے صحیح خدوخال نمایاں طور پر نظر آسکتے ہیں۔ ان اقتباسات کے جواب میں ہمارے اکثر دوستوں نے ہمیں لکھا کہ مولانا صاحب اب ان پارینہ داستانوں سے تائب ہو چکے ہیں۔ یہ انسانی خیالات تھے جن میں ہر آن تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہم ان کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ مولانا صاحب اپنے اُس وقت کے خیالات کی تائید میں ہمیشہ کتاب و سنت کی نصوصِ صریحہ پیش کیا کرتے تھے۔ اور اب موجودہ خیالات کی تائید میں جو اُن کے دورِ اوّل کے خیالات سے بالکل متضاد واقع ہوئے ہیں کبھی بھولے سے بھی قرآن و حدیث کی سند نہیں لاتے۔ اس

لئے یہ غلط ہے کہ مولانا صاحب پر جن حقائق کا اب انکشاف ہوا ہے۔ اُن کے پیش نظر وہ اپنے سابقہ اسلامی خیالات کو باطل سمجھتے ہیں۔ بایں الحمد کہ مولانا نے ہماری یہ مشکل بھی حل کر دی اور اپنے اس خطبہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ میرا مسلک آج بھی وہی ہے جو الہلال کے زمانہ میں تھا۔ فرماتے ہیں:-

مجھے معلوم نہیں آپ لوگوں میں کتنے ایسے آدمی ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گذر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔

(خطبہ صدارت ص ۲۸)

دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں۔

میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا۔ اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے لئے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لئے وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی تھی۔ (ص ۳۵)

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ حافظہ تازہ کرنے کی ضرورت مخاطبین کو ہے یا خود مولانا صاحب کو؟ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کے پاس الہلال کا کوئی پرچہ بھی موجود نہیں۔ ورنہ وہ اس بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعوے کبھی نہیں کرتے کہ جو کچھ میں ۱۹۱۲ء میں کہتا تھا آج بھی وہی کہتا ہوں۔ آیئے ہم مولانا صاحب کو بتائیں کہ وہ ۱۹۱۲ء میں کیا کہتے تھے اور آج کیا کہہ رہے ہیں مولانا صاحب ذرا توجہ سے سنیں کہ بڑی گہری تفکر طلب باتیں ہیں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس تمام خطبہ میں کہیں اللہ اور اس کے رسول کا نام نہیں آیا۔ اسلام کے کسی بزرگ کی جلالت و عظمت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بھولے سے بھی کسی اسلامی تاریخی واقعہ کا اشارہ تک نہیں آنے پایا۔ لیکن اس میں اگر کسی کی عظمت کا اعتراف ہے تو (نعوذ باللہ) اس وجود اقدس و اعظم" کی عظمت کا جو

عن الخطاء قرار پا جانے کی وجہ سے ہر نیشنلسٹ کے نزدیک خدائی صفات کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔" (ص ۲۱)

مہاتما گاندھی۔ عظیم روح۔ اللہ اکبر !!!

کبھی مولانا صاحب روح کی عظمت و رفعت کا یہ معیار قرار دیا کرتے تھے :-

"اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبتِ الٰہی اور انقطاع ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے اتنا ہی اس کے اعمال میں اخلاقِ الٰہی اور نورِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے۔ اور ان کی رُوح فیضانِ الٰہی سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تکمیلِ مرتبۂ انسانیت تک اس کا ارتفاع ہو جاتا ہے اور یہی "صراطِ مستقیم" اور "دینِ قیم" کا آخری مرتبہ ہے ..... (یہ) وہ قانونِ ارتقاء ہے جسے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔

(الہلال۔ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء ص ۱۳)

سن لیا آپ نے کہ مولانا صاحب اپنے پیر و مرشد گاندھی جی کے متعلق کیا ایمان رکھتے ہیں! اور ان کا مقام کن فلک پیما بلندیوں پر سمجھتے ہیں!

ہندوؤں کا یہ دعوٰے ہے کہ کانگریس ملک کی "قومی جماعت" ہے۔ اور اس کے سوا اور جتنی جماعتیں ہیں وہ فرقہ وارانہ ہیں۔ ان فرقہ وارانہ جماعتوں کی جدّوجہد اپنے اپنے فرقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ اس لئے جو کچھ کانگرس کر سکتی ہے یہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ یہی الفاظ مولانا صاحب کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ لکھا ہے :-

"بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں جو سیاسی جدّوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لئے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں۔" (ص ۲۳)

یعنی جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے وہ فرقہ وارانہ جماعتیں نہیں کر سکتیں۔ اب سُنیے کہ دورِ اولیٰ میں مولانا صاحب کیا فرماتے تھے :-

"کانگریس کمیٹیاں جو کام کر رہی ہیں ان میں ہندی مسلمان بھی ہندوؤں کے برابر کے شریک

ہیں۔ لیکن خاص مسلمانوں کے اندر سرگرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لئے کانگریس کا نظام کافی نہیں ..... کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں پچاس جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں کہ چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو تو وہ اثر پیدا نہیں ہوگا جو خلافت کمیٹی جمعہ کے دن مسجد میں ایک وعظ کر کے پیدا کر سکتی ہے"۔ (مضامین ابوالکلام آزاد صـ ۱۹۲۱)

اُس وقت یہ ارشاد تھا۔ آج اگر کوئی جماعت خالص مسلمانوں کے اندر سرگرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے تو اُسے فرقہ وارانہ قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کرنے کا فتویٰ صادر فرما دیا جاتا ہے اور اس پر دعویٰ ہے کہ میں اس مقام سے بول رہا ہوں جہاں دور الہلال میں کھڑا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں جو بنیادی اختلاف ہے اُسے چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:-

(۱) ہندو اس تمام ملک کو ایک "واحد کُل" (SINGLE UNIT) قرار دے کر ایک ایسے طرزِ حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس میں مرکز (CENTRE) ایک ہو۔ اس نظامِ حکومت کا نام آل انڈیا فیڈریشن ہوگا جو خالصتہً مغربی انداز کے نظامِ جمہوری کے قالب میں ڈھلا ہو۔

اس کے برعکس مسلمان یہ چاہتا ہے کہ ملک کے اس حصّہ کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ الگ کر کے وہاں ایک جداگانہ اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

(۲) ہندو تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے وحدتِ قومی (SINGLE NATIONALITY) کی بنیادوں پر نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ جداگانہ مستقل بالذات قوم قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے مسئلہ کو بین الفرق (INTER COMMUNAL) نہیں بلکہ بین الاقوامی (INTER-NATIONAL) مسئلہ سمجھتے ہیں اور وہ جداگانہ قوموں کی بنیادوں پر الگ الگ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر وضاحت سے طلوعِ اسلام کے صفحات پر آ چکے ہیں کہ ان پر اس وقت مزید بحث ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا صاحب ان مسائل کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

"ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (CONSTITUTION) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں آل انڈیا وفاق (FEDERATION) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے تمام حلقے (UNITS) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصّے میں صرف وہی معاملات رہیں گے

جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی وسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع (DEFENCE) کسٹم وغیرہ۔" (صفحہ ۳۱-۳۲)

یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جو یورپ کی ٹکسالوں سے مضروب ہو کر آیا ہے اور ہندو اسے اس لئے اختیار کرنا چاہتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ یہاں اپنی اکثریت کی بنا پر خالص ہندو راج قائم کر سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یورپ کی نقالی میں نظامِ زندگی اختیار کرنے کے متعلق مولانا صاحب کبھی کیا فرماتے تھے جمعیۃ العلمائے لاہور کے خطبۂ صدارت ۱۹۲۱ء کے دوران میں ارشاد ہے:-

"قوم افراد سے مرکب ہے اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کے لئے ضروری ہے کہ ایک جماعتی مسلک میں تمام افراد منسلک ہو جائیں اور فرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پر افرادِ قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیاتِ اجتماعی کے لئے کوئی نظام ہمیں دیا تھا یا نہیں! اگر دیا تھا اور ہم نے ضائع کر دیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے اسلام کا قرار دادہ جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں"

کیا مولانا صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے جس قسم کی جماعتی نظام کے قیام کی تلقین کر رہے ہیں وہ یورپ کے نقالی ہے یا اسلام کا عطا فرمودہ نظامِ حکومت؟ کیا وہ نظامِ زندگی یا طرزِ حکومت کبھی اسلامی قرار پا سکتا ہے جو کفار اور مومنین کی متحدہ قومیت سے وجود میں آئے اور جس میں فیصلے کفار کی اکثریت کے تابع ہوں! ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کس چیز کو اسلامی قرار دے رہے ہیں؟ کیا یہ وہی چیز نہیں جسے قرآن کریم طاغوتی نظامِ زندگی قرار دے رہا ہے اور جسے کانگریس نے یورپ کی دریوزہ گری سے حاصل کیا ہے؟ اس قسم کے فیڈرل نظام میں جہاں مختلف حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے۔ وہاں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت کی کیا حالت ہوگی؟ اس کی بابت پوچھئے اُن سیاہ اوراق سے جن پر آپ کی کانگریس کے اڑھائی سالہ عرصۂ حکومت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں اور پھر آپ کس بھولے پن سے ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات۔ دفاع۔ کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے سامنے رکھ سکتا ہے، ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے

جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔" (ص ۳۲)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بیرونی تعلقات اور دفاع (DEFENCE) وغیرہ کچھ ایسے اہم مسائل نہیں کہ جن سے خواہ مخواہ کے اندیشے پیدا کئے جائیں۔ "یہ بیرونی تعلقات، جسے اب اکثریت اور اقلیت کے پرفریب سوال کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ الہلال کے مولانا صاحب کے نزدیک کیا معنی رکھتے تھے۔ سنیئے۔ فرماتے ہیں:-

"پس اے عزیزانِ ملت اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیٔ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہدان لاالٰہ الااللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظینِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں، تو ہم اللہ اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی رُوح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے حدیثِ مشہور کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا:-

مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم، مثل الجسد، اذا اشتکیٰ لہٗ عضو، تداعی لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمی (الحدیث)

"مسلمانوں کی مثال باہمی مودت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی۔ اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس میں شریک ہو جاتا ہے۔

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے کہ:۔

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہٗ بعضاً۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے۔ جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے۔

اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک اوّلین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸ : ۲۹)

کافروں کے لئے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد۔

ان میں جس قدر سختی ہے، باطل اور کفر کے لئے۔ اور ان کی جس قدر محبت اور الفت ہے حق و صداقت اور اسلام و توحید کے لئے۔ فاعتبروا یا یھا المسلمون ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون۔"

یہ ہیں وہ بیرونی تعلقات جن کا آج یوں استخفاف کیا جا رہا ہے۔ سچ ہے۔ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔

جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں، سیاستِ حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم کے افراد ہیں یا مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندو تمام باشندگانِ ملک کو ایک "متحدہ قومیت" کے عناصرِ ترکیبی قرار دیتا ہے اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ:۔

بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس لئے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ لیکن ہندو اسے تسلیم نہیں کرتا اور مسلمان کو ایک اقلیت قرار دیتا ہے۔ مولانا صاحب نے اس باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ ان کی پریشانیٔ افکار کا ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے جس کا لفظ لفظ اس کشمکش کا غماز ہے جو ان کے ضمیر اور مصلحت کوشی میں جاری ہے۔ انہیں مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی اس لئے انہیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔

"میں نے اس زمانہ (زمانہ الہلال) میں بھی اپنے اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس

درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لئے انہیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیئے اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر اُن کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اُسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لئے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی .....

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اُسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیئے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو۔ اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (NUMBER) کے ساتھ نوعیت (QUALITY) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے

ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ، دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا۔ مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اُسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (FACTORS) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اُٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اُس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اُسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں۔ جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر وہ سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انہیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انہیں ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔"

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ مولانا صاحب کے نزدیک مسلمان اقلیت نہیں۔ اور اگر یہ اقلیت نہیں تو لامحالہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ لیکن ایسا کہنے سے تو ان کی نیشنل ازم کی عمارت دھڑام سے گر پڑتی

ہے۔ وہ ایسا کس طرح کہیں؟ اور کہنا بھی چاہیں تو وہ جن کی نظرِ کرم نے انہیں "راشٹرپتی" کے منصبِ جلیلہ پر فائز المرام کیا ہے، وہ ایسا کیوں کہنے دیں! اس باب میں مولانا صاحب جس مشکل میں جا پھنسے ہیں، انکی حالت قابلِ رحم نظر آتی ہے۔ اپنے خطبہ کے صفحات ۲۴ الغات ۲۶ پر انہوں نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کانگریس نے ہمیشہ اس بنیادی اصول کو سامنے رکھا ہے کہ ہندوستان میں جو دستور اساسی بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیئے اور ان تحفظات کے جج خود اقلیت ہوں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"آج بھی اس نے (کانگریس) نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا اعتراف کیا ہے ..... کہ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمایندوں کو چن کر بھیجیں"

قارئین کرام کو غالباً معلوم ہوگا کہ "تسلیم شدہ اقلیتوں" کی اصلاح گاندھی جی کی وضع کردہ ہے اور اس کی تصریح میں انہوں نے مسلمان اور سکھوں کا ذکر نمایاں طور پر کیا تھا۔

اب ذرا اس قضیہ کے صغریٰ اور کبریٰ کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ نتیجہ کیا مرتب ہوتا ہے؟

(۱) مسلمان اقلیت نہیں ہیں ـــــ مولانا صاحب خود بدلائل و براہین ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) مسلمان ایک الگ قوم بھی نہیں ہیں ـــــ کہ اس طرح دو قوموں کا نظریہ درست ماننا پڑتا ہے جو بقول مولانا صاحب سرکاری دماغوں کا وضع کردہ نظریہ ہے۔

(۳) مسلمان ایک تسلیم شدہ اقلیت ہیں ـــــ کہ مولانا صاحب کے رہنما گاندھی جی کا ارشاد ہے جو مولانا صاحب کے نزدیک وحیٔ منزل سے زیادہ واجب التسلیم ہے

تو پھر عقل حیران ہے کہ بالآخر مسلمان ہیں کیا۔؟

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

اگر یہ دانستہ فریب دہی نہیں تو خود فریبی کی اس سے زیادہ بیّن مثال بھی مشکل سے مل سکے گی۔

مولانا صاحب نے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا ہے کہ جب مسلمان اتنی بڑی جماعت رکھتے ہیں تو انہیں اپنے مفاد کے تحفظات کے متعلق ڈرنے کی کیا وجہ ہے! یہ دلیل بظاہر جتنی خوش آئند ہے درحقیقت اتنی ہی زیادہ پُر فریب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ اتنی بڑی جماعت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں

کرنا چاہیئے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ جس قسم کا نظامِ جمہوری آپ یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں، اس میں اتنی بڑی جماعت ایک چوتھائی کی اقلیت بن کر رہ جاتی ہے۔ جب آپ ہندوستان کو ایک کل (UNIT) مان لیں اور تمام ملک کا ایک مرکز (CENTRE) قرار دے کر جمہوری نظام قائم کر لیں تو اس مرکز میں مسلمانوں کی حیثیت چوتھائی سے بڑھ کس طرح سکتی ہے۔ لہٰذا اکثریت کے فیصلے غیر مسلموں کے فیصلے ہوں گے۔ مولانا صاحب! مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں لڑائی آپڑی ہے آئینی جس میں آدمی گنے جاتے ہیں، تولے نہیں جاتے۔ اگر تولے جانے کا مسئلہ ہوتا تو پھر ڈرنے کی کیا بات تھی!

اب اس اہم موضوع پر آتے ہیں جو اس تمام خطبہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمان ایک الگ قوم نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جزوِ لاینفک ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری راہ نمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد دوسرا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک حجازی قافلہ ہم پیرانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر، جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم پر مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔" (ص ۳۶-۳۷)

(۱) "کانگریس جو قدم بھی اُٹھانا چاہتی ہے، ہندوستانی قوم کے لئے اٹھانا چاہتی ہے۔" (ص ۲۴)

(۲) یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں، سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ (ص ۲۹-۲۸)

"متحدہ قومیت" کے اس اصول کی وضاحت مندرجہ صدر الفاظ میں کی گئی ہے۔ اس مرصّع غزل کا آخری شعر بھی سنتے جائیے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مُہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔" (ص ۳۹)

اللہ اکبر! کفار اور مسلمان ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے ایک ناقابلِ تقسیم قوم بن جاتے ہیں! کفر و اسلام ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک نئی تہذیب میں تحلیل ہو سکتے ہیں! یہ قدرت کا اٹل قانون ہے! یہ تقدیر کا فیصلہ ہے! اس پر قسمت کی مہر لگ چکی ہے! اس متحدہ قومیت کو خود دستِ قدرت نے تیار کیا ہے! مسلم و کافر کی علیحدگی کا تخیل بناوٹی ہے۔!!

یا اللہ! یہ ہم کیا سن رہے ہیں! اور کس سے سن رہے ہیں۔!

یہ وہ آواز سُن رہے ہیں جس کے مٹانے کے لئے حضرت نوحؑ سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاءِ کرامؑ کا پورا سلسلہ پیغامِ خداوندی کو لے کر ظلمت کدۂ عالم میں آتا رہا۔ اور سُن رہے ہیں اس شخص کی زبان سے جس کی ساری "اسلامی عمر" اس پکار میں گزر گئی کہ یاد رکھو۔ قومیت پرستی کی یہ آواز بلاشائبۂ تشکیک شیطان کی آواز ہے۔ اس کے فریب میں آجاؤ گے تو سیدھے جہنّم کے عمیق گڑھوں میں جا گرو گے۔ اور ہاں! بدبختی یہ کہ یہ آواز اس کی زبان سے سُن رہے ہیں جو آج بھی دعوےٰ کرتا ہے کہ:۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔" (ص ۳۶)

ہم حیران ہیں کہ کفر و باطل کے اس اسلام سوز نظریہ کی تردید میں الہلال کے کتنے اقتباسات پیش کریں۔ اس کے تو پورے کے پورے مجلدات اس ایک دعوت کے نقیب ہیں کہ:۔

"مسلمانوں کی قومیتِ صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔" (خطبۂ صدارت مولانا آزاد ۱۹۲۱ء)

اس کا تو ایک ایک ورق، ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اس دجل و فریب کی دھجیاں بکھیرنے کے لئے تھا کہ دنیا نے جس قدر قومیتوں کی بنیادیں وضع کی ہیں سب ابلیسانہ حیلہ کاریاں ہیں۔ مسلمانوں کی قومیت کا مدار صرف مذہب ہے۔ اللہ کا قانونِ ابدی ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

ہم فی الواقعہ متحیر ہیں کہ کون کون سے اقتباسات پیش کریں اور کہاں کہاں کے حوالے دیں۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ انبیاء کرام کا سلسلۂ رُشد و ہدایت اسی دعوت کے نشر و اشاعت کے لئے دنیا میں قائم ہوتا رہا ہے کہ وہ انسانی رشتۂ قومیت کے ان تمام غیر فطری معیاروں کو منہدم کر دے جو رنگ نسل۔ وطن کے بولہبی تصورات سے وضع ہوتے ہیں۔ اور اُن کی جگہ صرف ایک معیارِ قومیت کو باقی رکھے جو اللہ کا متعین فرمودہ ہے۔ اور وہ معیار حقہ ہے اشتراکِ عقائد یعنی مذہب۔ "عہدِ اسلامی" کے مولانا آزاد اس باب میں فرماتے تھے۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازاتِ قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بناء پر ان کی دعوت کا اوّلین اُسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اسی طرح نسلی قربانی کا طاقت ور حربہ تیار کریں۔ اس قربانی کا اثر ان تمام کاروبارِ دعوت میں سب سے زیادہ کارکن ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعی الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اُجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جس کی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیاءِ کرام و رسلِ عظام کے اس سلسلہ میں جنہوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے اور چونکہ ان کی دعوت اس پہلی قسم کی دعوت تھی اس لئے ضرور تھا کہ اس اوّلین قربانی کا بھی وہ اُسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمہارا بیٹا عملِ صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جس کی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا۔ لیکن اس نے عملِ صالح کی جگہ عملِ غیر صالح سے رشتہ جوڑا۔ پس اب اس کا ذکر بے کار ہے۔ اور یہ بناءِ قومیت کا وہ ناموسِ الٰہی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہیئے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ۔ حضرت نوحؑ نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میں اپنے ضعفِ بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی میں نے اس کی نسبت تجھ سے سوال کیا۔"

پھر ارشاد ہے:۔

"حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی اُمت کی بنیاد رکھنی چاہی تھی اگرچہ ضلالتِ عصر اور جہل انسانیت

اس سے دست و گریباں رہی اور اس لئے مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (۱۱-۱۶) ان پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی مگر ایک چھوٹی جماعت کو، تاہم جس اُمتِ صالحہ کی اس عہدِ اُولیٰ میں بنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی۔ اور خدا کا کوئی حکم دعوتِ ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوحؑ، پر بہت کم لوگ ایمان لائے۔ کیونکہ انسانی مدینہ و عمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم تر دَور تھا اور مذہب کا سلسلۂ وار ارتقاء ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا۔ لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے صدیقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لے گئی۔

یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور اس کی بنیاد محض اخوۃِ دینی پر قائم ہوتی ہے۔ پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماورا بن کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصہ۔ اقوام و ملل کی ہر نسل اُس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔" (البلاغ ۱۱/۱۹۱۵ (۱۲)

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ خود انبیائے کرام علیہم السلام جس قومیت کی تاسیس کے لئے تشریف لاتے رہے۔ کیا وہ وہی قومیت ہے جو اشتراکِ وطن سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اور مولانا صاحب جس کے آج اس فخر و مسرت سے لانیفک عنصر بننے کا اعلان فرماتے ہیں یا یہ وہ قومیت ہے جسے مٹانے کے لئے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رہا تھا۔

اب کوئی کفر کو اسلام کہنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟

یہ الہلال کے مولانا آزاد تھے اور آج کے مولانا آزاد قومیت کا معیار وطن کی چار دیواری قرار دے رہے ہیں۔ الہلال والے ابوالکلام لکھتے ہیں:-

"انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لئے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لئے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ:-

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔

اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس لیئے کہ باہم پہچانے جاؤ۔ ورنہ دراصل یہ تفریق والتشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز اور شرف اسی کے لیئے ہے۔ جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے" وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ"۔ لیکن وہ اس کو کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے، پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہونا چاہیئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲) بے شک تمہاری جماعت ایک ہی اُمّت ہے۔ اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔

اے برادرانِ ملّت! یہی اسلام کی وہ عالم گیر اخوت اور دعوتِ اسلام کی وحدت تھی جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستان حجاز میں ظہور کیا مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبلِ بوقیس کی گھاٹیوں سے اُٹھی۔ مگر دیوارِ چین سے صدائے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظریں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروانِ اسلام کے نقشِ قدم گن رہی تھیں عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سینکڑوں ہاتھ تھے جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لیے وضو کر رہے تھے۔ وہ تمام دنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے۔ جن کو شیطانِ رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن خدائے رحیم نے انکے صدیوں بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعے پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور ان کے روٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملایا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریکِ رنج و راحت ہو گئے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا

اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر نازل کی گئی جب کہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں اُلفت و محبّت پیدا کر دی، اور دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا، بجز اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو۔ خواہ الجیریا کا وحشی ہو۔ خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے۔ تو اس ایک خاندانِ

توحید کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے۔ بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہدِ مؤدّت، خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبّت ٹوٹ جائیں۔ مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے ایک عرب کے بدو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نومسلم کو مکہ معظمہ کے صحیح النسب قریشی سے پیوست و یک جان کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے۔ اور اس زنجیر کو کاٹ سکے جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لیے جکڑ دیا ہے۔"

الہلال۔ ۶ نومبر ۱۹۱۲ء

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم چاہیں تو اس موضوع پر صفحات کے صفحات الہلال وغیرہ سے پیش کرتے جائیں۔ لیکن عدم گنجائش زیادہ طوالت کی مانع ہے۔ اس لیے اس عنوان پر مزید اقتباسات سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہوئی تو کبھی پھر سہی۔ انشاء اللہ۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ہمارا شائع کردہ پمفلٹ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی" ملاحظہ فرمایئے۔ اس وقت ضمناً دو تین باتیں اشارۃً عرض کرنا ضروری ہیں۔ متحدہ قومیت سے مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے نظامِ جمہوری میں امورِ مہمّہ کے فیصلے مسلم و غیر مسلم دونوں کی مشترکہ اکثریت سے نفاذ پذیر ہوں گے۔ مسلمانوں کی خالص جداگانہ اکثریّت کا اس میں کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت معیارِ فیصلہ قوم کی اکثریت ہوگا۔ نہ کہ مسلمانوں کی اکثریت۔ اس لئے کہ جب دونوں مل کر ایک قوم ہو گئے تو پھر الگ الگ ہستی کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ لیکن دیکھئے کہ الہلال والے مولانا آزاد اس باب میں کیا فرماتے تھے:۔

"اسلام میں حقِّ امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ تو اس کے احکامِ دینیہ کیونکر تابع آراء اشخاص و جماعتِ مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس لئے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے یا پھر دنیوی امور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریتِ رائے سے عبادت ہے۔"

الہلال ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء

آج ہم سے کہا جاتا ہے دینی امور میں فیصلے مسلمانوں کی اپنی اکثریت سے ہوں گے۔ اور دنیاوی امور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قوم کی اکثریت سے لیکن خود مولانا صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ دنیاوی امور میں بھی مسلمانوں کے فیصلے وہ اجماع کر سکتا ہے جو تمام مسلمانوں کی رائے سے عبادت ہے۔" اس لئے کہ اسلام میں مذہب و سیاست، دین و دنیا کوئی الگ الگ شعبے نہیں ہیں۔ ان میں تو باہمی ایسا التزام و امتزاج ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ناممکن

ہے۔ اب فرمایئے کہ مولانا صاحب کی "متحدہ قومیت" کی اکثریت کے فیصلے مسلمانوں کے نزدیک کس طرح قابل قبول ہو سکتے ہیں۔!

یہ ہیں وہ مولانا صاحب جن کا دعوےٰ ہے کہ میں آج بھی الہلال کے مقام سے بول رہا ہوں۔ انہیں تو چاہیئے تھا کہ اپنے خطبۂ صدارت سے پہلے فرماتے کہ "ہم وار دھا کے ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ ابھی آپ کو مہاتما گاندھی کا ایک ریکارڈ سنایا جائے گا۔"

پھر مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصوّر "سرکاری دماغوں" کا پیدا کردہ ہے۔ قومیت پرست حضرات کا یہ پرانا مرض ہے کہ جس کسی سے اختلاف ہوا جھٹ کہہ دیا کہ وہ گورنمنٹ کا آدمی ہے۔ سرکار پرست ہے ٹوڈی ہے دشمنِ آزادی ہے۔ اور اسے یوں نکو بنا کر اصل موضوع سے الگ ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ اس باب میں مولانا صاحب بھی اسی بازاری سطح پر اتر آئے۔ اور جب اور کوئی دلیل نہ سوجھی تو کہہ دیا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا خیال سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ صفحاتِ گزشتہ میں مولانا صاحب کی تحریروں کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں کی الگ قومیت کا تصوّر "سرکاری دماغوں" کا وضع کردہ ہے۔ یا یہ تخیل سرکارِ مدینہ رحمتِ دو عالم حضور رسولِ کافۃ للناس پر نازل شدہ ضابطۂ خداوندی نے متعیّن فرمایا ہے۔ وہی چیز جو الہلال کے دور میں عین قرآنی تھی، اصل اسلام تھی، آج "سرکاری دماغوں" کی وضع کردہ" بتائی جاتی ہے۔ ذرا سوچئے کہ سرکاری دماغوں کا وضع کردہ "مسلمانوں کی جداگانہ قومیت" کا تصوّر ہے۔ یا اس قومیت کا تصوّر جسے مولانا صاحب اشتراکِ وطن کے بولہبی معیار کے مطابق اب متشکل فرما رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جغرافیائی حدود کی بنا پر تخلیقِ قومیت کا نظریہ یورپ کا پیدا کردہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس نظریہ کی طرف دعوت دینے والوں کے متعلق مولانا صاحب کا کیا ارشاد تھا۔ البلاغ جلد نمبر ۲ نمبر ۲ کے عربی افتتاحیہ میں مولانا صاحب نے جو کچھ لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"اور فرنگیت کے خطیب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو مغربیّت کی پیروی کرو۔ تمہاری حیات رابطۂ اسلامی میں نہیں اس لیے کہ مغربی تمدّن کی نظروں میں رابطۂ اسلامی کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اور مسلمانوں نے ازمنۂ گزشتہ میں جو قرآنِ کریم کی پیروی سے عزّت و وقار حاصل کیا تھا وہ چیز اس زمانے میں کارآمد نہیں اسے یورپین تمدّن نے منسوخ کر دیا اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر فائز المرام ہونا چاہتے ہو تو فرنگیت کو مضبوطی سے تھام لو اور قومیت پرستی کا زور شور سے اعلان کر دو۔ اگر تم ایمان دار ہو تو۔

لیکن یہ لوگ شیطان کے گروہ میں سے ہیں اور یاد رکھو، شیطان کا گروہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

مولانا صاحب آج اشتراکِ وطن کی بنا پر قائم شدہ قومیت میں تمام مصائب کا حل بتاتے ہیں۔ لیکن یہی مولانا صاحب

اپنے اسلامی دور میں فرماتے تھے کہ :-

"ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیّت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظِ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے اس وقت تک ان میں نہ قومیّت کی روح پیدا ہو سکے گی۔ اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے وہ اثر صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں کے دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو 'خدا یا اسلام' ہے"

اس وقت مسلمانوں کی روح کو گرمانے والے الفاظ "اسلام" اور "خدا" کے تھے۔ آج اس کے اندر حرارت پیدا کرنے کے لیے "اشکدہ وطنیّت" کا راستہ بنایا جا رہا ہے۔ اس وقت کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی کوئی قومیّت زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق نہیں رکھتی اور آج انہی جغرافیائی تقسیم پر قائم شدہ قومیّت کو قدرت کا فیصلہ بتایا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس قسم کی غیر اسلامی متحدہ قومیّت کا اثر کیا ہوتا ہے۔ خود مولانا صاحب کے الفاظ میں سنئیے۔ اپنے خطبۂ صدارت کے صفحات نمبر ۳۹-۳۸ پر ارشاد فرماتے ہیں :-

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ مگر انہوں نے مل جل کر ایک سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیّت کی ایک دولت ہے۔ اور ہم اُسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے۔ تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب

ایسے خیالات اُگ نہیں
ہے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں
سکتے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (REVIVAL) مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں ترقی سے انکار

کرنا ہے۔"
"ایران اور وسط ایشیا" لکھ کر مولانا صاحب نے نہایت سادگی لیکن پُرکاری سے
ذرا الفاظ کی سحر طرازی ملاحظہ فرمایئے۔
ایک اہم اعتراض سے بچ نکلنے کی کوشش کی ہے۔ گویا ظاہر انہوں نے یہ کرنا چاہا ہے کہ وہ اس تہذیب و معاشرت کی
تجدید کے خلاف ہیں جو مسلمان عجم سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اسلامی تہذیب و معاشرت کے خلاف نہیں۔ لیکن مولانا
صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ صرف "ایران و وسط ایشیا" کے دو لفظ لکھ دینے سے آپ اپنے دامنِ تقدس کو بچا کر نہیں نکل سکتے۔
ذرا ان الفاظ کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالیے اور سوچیے کہ آپ زبان، رسم و رواج، شعر و ادب، معاشرت۔ ذوق
اور روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں کے متنوع گوشوں میں سے کسی ایک گوشہ کے لئے بھی اس زمانہ کی طرف لوٹنا
نہیں چاہتے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمان یہ تمام کی تمام چیزیں
وسطِ ایشیا اور ایران سے ہی اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ بلکہ ان کے تمدن و تہذیب کی آب و گل میں خاکِ پاکِ حجاز
کا بھی کافی عنصر شامل ہے۔ اور مسلمان اپنی عجمی تہذیب کا احیاء نہیں بلکہ خالص اسلامی تہذیب کا احیاء چاہتے ہیں
جس کی نسبت مولانا صاحب کبھی فرمایا کرتے تھے:۔
"میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت و حصولِ عظمتِ ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں
بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف تجدید کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو
دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے۔ اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن
آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں
تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و جواہر کو نظرِ حسرت و طمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔
ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہیئے جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی۔
مولانا صاحب کا ارشاد ہے کہ ہندو اگر اپنی ہزار سالہ پیشتر کی تہذیب کا احیاء کرنا چاہتے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ
یہ وہ خواب ہے جو کبھی پورا نہ ہو گا۔ گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ متحدہ قومیت میں ہندو بھی اپنی پرانی تہذیب کو از سرِ نو
رائج نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ہر وہ شخص جس کی نگاہوں سے اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت سلب نہیں کر لیا۔ اچھی طرح سے
دیکھ سکتا ہے کہ ہندو اپنی اس تہذیب کہنہ کا کتنا بڑا حصہ اس وقت ملک میں رائج کر چکے ہیں اور بقیہ کی ترویج و تنفیذ
میں کس شدت سے کوشاں ہیں۔ کیا کانگرس کا ڈھائی سالہ دورِ حکومت محض اسی مقصد کے حصول میں صرف نہیں
کیا گیا کہ کسی طرح پراچین کی پرانی تہذیب کا احیاء کیا جائے۔ اور مسئلوں کو چھوڑیئے۔ ایک زبان ہی کو لیجئے۔ دیکھئے کہ

اس دو تین سال کے عرصہ میں وہ کیا سے کیا ہو چکی ہے اور کیا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ خود "ابوالکلام" بھی "چناؤ" اور "سبھاؤ" جیسی پر نتو نما زبان لکھ رہا ہے اور اس پر بھی مسلمانوں کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نہیں۔ فکر نہ کرو۔ ہندو اپنی پرانی تہذیب کو رائج نہیں کر سکتے! دور کیوں جائیے۔ مولانا صاحب سے صرف اتنا پوچھئے کہ جس کانگرس نگر سے آپ ابھی ابھی تشریف لا رہے ہیں وہاں آپ نے کیا منظر دیکھا کہ اس میں پراچین تہذیب کی کوئی جھلک آپ کو نظر نہیں آتی تھی۔ جناب خود صدر سے "راشٹر پتی" بن چکے ہیں۔ اور اس پر بھی آپ کو پراچین تہذیب کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے ؟ اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے !

اب حضرت مولانا صاحب کے خطبۂ صدارت کے مقطع کا بند بھی سنیئے۔ سنیئے اور سر پکڑ کر بیٹھ جائیے کہ یا اللہ! جب کوئی شخص تیرے پیامِ ابدی سے مذاق کرتا ہے تو اس کا کیا حشر ہو جاتا ہے! فرماتے ہیں اور وہی مولانا صاحب فرماتے ہیں جو ابھی ابھی اعلان فرما رہے تھے کہ "میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں کہ :-

"آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے :-

(۱) اتحاد

(۲) ڈسپلن۔ اور ــــــ اور (سنیئے۔ سنیئے۔ ذرا کلیجہ تھام کر سنیئے)

مہاتما گاندھی کی راہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا راہ نمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا۔ اور اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔" (صـ ۳۹)

پھر سنیئے ان الفاظ کو :-

"یہی ایک تنہا راہ نمائی ہے"

یہ مولانا صاحب کا ایمان ہے۔ اور قرآن کا ارشاد ہے کہ :-

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ (۳/۷۲)

کہدے کہ راہنمائی صرف ایک ہے اور وہ راہ نمائی اللہ کی ہے۔

ایک انسان کی راہنمائی اور پھر انسانوں میں سے بھی ایک غیر مسلم کی راہ نمائی۔ استغفراللہ ربی۔ سنیئے کہ دورِ اسلامی کے مولانا آزاد اس قسم کی راہ نمائی کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ ارشاد ہے :-

" اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم

اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارہ نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔"

لیکن غیروں کے آگے سر اسی وقت جھکتے ہیں جب انہیں قبلۂ حاجات سمجھ لیا جائے جب انہیں "اَن داتا" قرار دے لیا جائے۔ اُف!

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کوتاہی کیا! یہاں تو بازو ہی ٹوٹ گئے۔

... وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (۲۲/۳۱)

"جو اللہ سے شرک کرتا ہے اُس کی مثال یوں سمجھیئے کہ گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے (زمین کی پستیوں پر) آگرا۔ اُسے کوئی (پنجے دار) بڑا پرندہ اُچک کر لے گیا۔ یا ہوا کا تیز جھونکا اُسے (پرکاہ کی طرح) کسی دور دراز مقام کی طرف اڑا کر لے گیا۔"

مولانا صاحب کبھی فرماتے تھے :-

"البتہ بطور تحدیثِ نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے مجھ کو یہ راہ سوجھائی کہ مسلمانوں کے پولیٹیکل نصب العین کو بھی قرآنِ کریم سے ماخوذ ہونا چاہیئے۔ اور ان کو اس راہ میں بھی از روئے مذہب قدم رکھنا چاہیئے۔ نہ کہ باتّباعِ حریتِ جدیدۂ یورپ و تقلیدِ اخوانِ وطن۔ پھر یہ اس کا ایک فضل ہے اور اس میں گلے شکوے کی گنجائش نہیں۔ آج چالیس برس سے مسلمان پالیٹیکس پر انکار یا اقرار کے لحاظ سے بحث کر رہے ہیں، لیکن براہِ کرم بتائیے کہ آج تک ایک صدا بھی تمام اسلامی ہند میں اس کی بلند ہوئی ہے؟ آج تک مسلمانوں نے اور ان کے تمام لیڈروں نے پولیٹیکل آزادی کو ہمیشہ ہندوؤں کی آرزو اور یورپ کے

نئے آزادانہ دور کا نتیجہ سمجھا۔ لیکن کسی نے اس پہلو پر نظر نہ ڈالی کہ خود اسلام بھی مسلمانوں کو ان کی سیاست کے لئے کوئی بلند جگہ دیتا ہے یا نہیں۔ اس کا دعوےٰ کس کو ہے کہ نئی بات دکھلا دی، البتہ ایک کھوئی ہوئی بصارت تھی جواب واپس آگئی۔" (الہلال ۲۰۰۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

لیکن افسوس کہ یہ بصارت مستقل طور پر مولانا کے پاس نہ رہی۔ آئی اور مولانا صاحب نے جا کر خدائے واردھا کے قدموں میں ڈھیر کر دی اور خود اس کی لاٹھی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۔ (۲/۱۶-۱۷)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ لیکن ان کی تجارت انہیں کوئی نفع نہ دے گی یونہی راہِ راست کھو بیٹھے۔ ان کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص آگ جلائے اور جب اس سے اس کا ماحول روشن ہو جائے تو اللہ اس کی روشنی سلب کر کے لے جائے اور وہ پھر اندھیرے میں اندھوں کی طرح رہ جائے کہ دوسروں کی لاٹھی کا سہارا ڈھونڈتا پھرے۔"

وہی کفار جن کی راہ نمائی پر اعتماد کی تلقین کی جا رہی ہے کبھی ان کے متعلق ارشاد تھا:۔

"کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں۔ حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں نقضِ امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظِ امن کا لباس پہناتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں۔ اور اُسے جاں بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی بیچ میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور جتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرماں برداری جرم ہے۔ گناہ ہے۔ موجبِ عذاب ہے۔ اس قلاوے کو توڑ دینا چاہیئے۔ اس اطاعت سے تبرّی فرض ہے۔ اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے۔ اُن کی تو خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں خوشامد کریں۔ ریاکاری کریں۔ منافقت کریں تو انہیں بھی اظہارِ نفاق کا موقع ملے۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے؟ کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہدِ محکم ہے۔ یہ قول و اقرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ اُن کے حلف پر نہ جانا۔ یہ اِدھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں۔

قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منعِ خیر کے لئے نہایت مبالغے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے۔ پاس عزت نہ رکھنے، ناموس کی نگہداشت ضروری نہ سمجھنے اور خاص خاص حالتوں میں رضامندی کے ساتھ حرام کاری تک کو قانوناً جائز قرار دینے کی وجہ سے تو ان کی اصل تک محفوظ نہیں۔ یہ تو صریح بداصل ہیں پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے؟ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرطِ دولت و تکثیرِ آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔"

(الہلال - ۲۷ ۸/۱۹۱۳)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:-

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہو گی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرتِ کاملہ کوئی اور انتظام کر دے گی۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ الآن قد ندمت و لا ینفع الندم۔ اس وقت تم نادم ہوئے جب ندامت مفید ہی نہ رہی۔"

(مضامین آزاد حصہ سوم)

کہاں تک لکھتے چلے جائیے۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

آنکھوں والے کے لئے اتنا ہی کیا کم ہے۔ وہ یہ کچھ دیکھ کر یقیناً متعجب ہو گا کہ بالآخر کیا بات ہے کہ مولانا صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے آج گمراہی و ضلالت کے اس قدر عمیق گڑھوں میں جا گرے ہیں۔ اور اپنے ہی گرنے پر اکتفا نہیں، قوم کو بھی اسی جہنم کی طرف بلائے جا رہے ہیں۔ یقیناً یہ سوال فطری طور پر آپ کے دل میں پیدا ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں خود مولانا صاحب سے سنیئے۔ "جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے تو اس کی مقدم کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسی قوم کے سوچنے والے دماغوں اور دیکھنے والی آنکھوں کو قابو کر لے۔ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ زمانہ کی شہادات آپ کے روبرو ہیں۔ انہیں دیکھئے اور غور کیجئے کہ دنیا کس طرح اس "اصول" پر عمل پیرا ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یذبحون ابناءھم (بنی اسرائیل کے ابناء کا قتل) کچھ فرعونِ مصر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا۔ دنیا میں ہر مستبد قوت اس قسم کے قتل کرتی چلی آئی ہے اور کر رہی ہے۔ فرق صرف آلاتِ قتل و ذرائع استھلاک میں ہے۔ یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ ہندوؤں نے جب یہاں مسلمانوں کو غلام بنانے کی ٹھانی تو انہوں نے بھی سب سے پہلے اسی حربہ کو استعمال کیا اور مسلمانوں میں یذبحون ابناءھم شروع کر دیا۔ ملتِ اسلامیہ کے ہونہار

سپوتوں میں سے کچھ ایسے تھے جو ہندوؤں کے دامِ فریب سے بچ کر نکل بھاگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔" دنیا میں زنجیریں صرف لوہے کی نہیں ہوتیں اور چیزوں کی بھی ہوتی ہیں۔ سنیئے کہ مولانا صاحب اس باب میں کیا فرمایا کرتے تھے :-

"سالکِ راہِ حریت وصداقت کے پاؤں میں اس کے دشمن لوہے کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آئندہ کے منازل طے نہ کر سکے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ زنجیر لوہے کی جگہ سونے کی ہوتی ہے۔ وہ اس طلسمی زنجیر کو دیکھ کر راہ ورسمِ منزلِ صداقت پرستی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف دوڑ جاتا ہے اور مسکراتا ہوا خود دشمن کے ہاتھ سے لے کر اپنے پاؤں میں ڈال لیتا ہے۔ یہ طلسمی زنجیر کیا ہے؟ امید اور طمع جا!

لیکن آہ! کس قدر دنی الوجود کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حبِ مال اور الفتِ زر کے لئے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک فانی شئے کے لئے حق وصداقت کی باقی لازوال دولت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتا ہے۔ وہ چاندی سونے کے سکوں کو اگر خدا کے لئے اور اس کی سچائی کے لئے کھو دے تو خدا اُسے سچائی کے ساتھ واپس دلا سکتا ہے۔ پر جو خدا کی محبت کو دولت کے لئے کھوتا ہے وہ تو اسے دولت نہیں دلا سکتی۔ پھر انسانیت کے لئے کیسی دردانگیز موت ہے کہ انسان آسمان کی سب سے بڑی عزت کو زمین کی سب سے بڑی ذلت کے لئے کھو دے!

کتنے بڑے بڑے تاجدار، پُرہیبت فاتح، عظیم الشان سپہ سالار، نامور محبِ وطن اور محبوب القلوب ملت پرست انسان ہیں جن کی حق پرستانہ عزائم کی استقامت کو اسی لعنتِ طمع نے ڈگمگا دیا۔ انہوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنی فوج اور دراصل اپنے خدا اور اس کی صداقت سے غداری کی، اور دشمنوں کے لئے دوستوں کو، غیروں کے لئے اپنوں کو، ظالموں کے لئے مظلوموں کو، بے رحم فاتحوں کے لئے بیکس مفتوحوں کو، اور شیطان کے تخت کی زیب وزینت کے لئے خدائے رحمٰن کے دربارِ اجلال کی عزت وعظمت کو چھوڑ دیا! تاریخ کے صفحات ہمیشہ سے اسی دَور کے ماتمی ہیں۔ قوموں اور ملکوں کی داستانیں ہمیشہ اسی ناپاک سرگزشت پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ اور دولت پرستی کی ملعون نسل آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لئے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ رہی ہے۔ فی الحقیقت راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی کی چمک اور سونے کی سُرخی ہی ہے۔ اور اگر اس منزلِ پُرخطر سے تم گزر گئے تو پھر تمہاری ہمت بے پروا اور تمہارا عزم ہمیشہ کے لئے بے خوف ہے۔ یہی طمع کا خبیث دیو ہے جس کا پنجہ بڑا ہی زبردست اور جس کی پکڑ قلبِ انسانی کے لئے بڑی ہی مضبوط ہوتی ہے اسی نے فرزندانِ ملت سے غیروں کے آگے مخبری کرائی ہے۔ یہی پکڑ پکڑ کے ابناءِ وطن کو لے گیا ہے اور غیروں کے قدموں پر اخلاق کی ناپاکی اور جذبات کی کثافت کے

کیچڑ میں گرا دیا ہے تاکہ اپنے وطن، اپنی سرزمین اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کے خلاف جاسوسی کریں! اسی نے بڑے بڑے مدعیانِ خدمتِ ملک وملت کی برسوں کی کمائی ایک آن کے اندر ضائع کر دی ہے اور انہیں چارپائیوں کی طرح گرا دیا ہے تاکہ برسوں کی سچائی کو ایک لمحہ کی طمع پر قربان کر دیں۔ آہ یہی انسانیت کے لئے وہ روحِ خبیث ہے جو بڑے بڑے پاک جسموں، بڑی بڑی مقدس صورتوں، بڑے بڑے پُراز علم وعمل دلوں کے اندر حلول کر گئی ہے اور فرشتہ سیرتوں نے شیطانوں کے اور ملکوتی صفات ہستیوں نے خونخوار عفریتوں کے سے کام کئے ہیں۔" (مضامین آزاد)

آہ! ہم یہ لکھ رہے ہیں اور قلب خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آرہا ہے ہاتھوں میں قلم کانپ رہا ہے! کہ اے اللہ جو تیری درگاہ سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے! اے مالک الملک صدقہ اپنی رؤف الرحیمی کا۔ غربت وافلاس، بھوک اور پیاس کی زندگی دے دینا لیکن طمع جاہ وہوسِ زر کی نظر فریب افسونگرانہ کشش وجاذبیت سے بچائے رکھنا کہ جو اس سحر سے مسحور ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ اور جو تیرے در سے ٹھکرا دیا گیا اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ یوں تو لغزش ہر ایک کی خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن ایک عالم کی لغزش تو وہ ہے جس کے متعلق خود نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ:-

"میں اپنی اُمت کے حق میں سب سے زیادہ جن باتوں سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہیں:-

(۱) عالم کی لغزش۔ (۲) منافق کا قرآن سے استدلال۔ (۳) اور گمراہ کرنیوالے سردار (لیڈر)۔"

کہتے ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ ایک دن بازار سے گزر رہے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اور راستہ میں کیچڑ تھی۔ ایک لڑکا ادھر سے گزرا تو آپ نے فرمایا کہ بیٹا! احتیاط سے چلو۔ قدم نہ پھسل جائے۔ گر جاؤ گے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور آپ کو پہچان کر کہا کہ حضور! میرے گرنے کی فکر نہ کیجئے۔ اپنے آپ کو سنبھالئے میں گرا تو خود ہی گروں گا اور اگر (خدانکردہ) آپ گر گئے تو ساری دنیا گر جائے گی۔

کس قدر صحیح تھا اس بچے کا تبصرہ۔ زید وبکر گمراہ ہوں تو ان کی گمراہی ان کی ذات تک محدود رہے گی۔ لیکن "کوئی ابوالکلام آزاد" صحیح راستہ چھوڑ جائے تو پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبے۔ ایک لیڈر کی یہی لغزش ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ ۚ..... (۱۴/۲۸-۲۹)

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناسپاسی سے بدل

دیا۔ اور اپنی قوم کو تباہی و بربادی کے جہنم میں لے گئے۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قوم بروقت متنبہ ہو گئی اور جہنم میں گرنے سے بچ گئی۔ اے کاش آج بھی اللہ تعالےٰ ان جہنم میں گرنے والوں کی چھنی ہوئی بصارت انہیں واپس دیدے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ فریبِ نفس نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے بشرطیکہ دلوں اور آنکھوں پر مُہر ہی نہ لگ چکی ہو۔ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔

بقیہ نقد و نظر از صفحہ

ہمیشہ خانہ کعبہ ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

قرآن مجید کی جس آیت یعنی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ سے ہمارے بعض اہلِ علم کو جو غلط فہمی ہوئی ہے، تو حقیقت میں اس آیت میں آپؐ کی جس آرزو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تحویلِ قبلہ کے بارے میں نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس حقیقت کی غماز تھی کہ خانہ کعبہ ابھی تک کفارِ مکہ کے قبضے میں تھا اور آپؐ بار بار آسمان کی طرف منہ کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار فرماتے تھے۔ کہ اس پر سے کفار کا قبضہ ختم ہو اور مسلمانوں کا مرکزِ ملت خود ان کی اپنی تولیت میں آجائے۔

بحث کو زیادہ تر قرآنِ مجید تک محدود رکھا گیا ہے۔ اور اس بارے میں جو روایات ملتی ہیں، انکے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ وہ یہودیوں کی کارستانیاں ہیں، فرماتے ہیں:۔

"تاریخ بھی کس قدر ظالم ہے کہ جب نبی اکرمؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو تصدیق کے لیے حضورؐ کو ایک یہودی عالم ورقہ بن نوفل کے آستانہ پر حاضری دلوائی، معراج کے دوران نمازوں کے فرض ہونے کے سلسلے میں حضورؐ کی رہنمائی، حضرت موسیٰؑ نے فرمائی، جہاں قبلہ کا سوال پیدا ہوا۔ تو حضورؐ کو خانہ کعبہ کی بجائے، جو آپؐ کا آبائی اور اسلام کا قبلہ تھا، بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے دکھایا گیا ہے۔ یہ ہیں وہ واقعات جن سے یہود کی برتری ثابت کرنا مقصود ہے۔ صد افسوس کہ اس کام کو یہود کی جگہ مسلمان سرانجام دے رہے ہیں"۔

اس موضوع سے متعلق مصنف نے، اپنے تئیں تحقیق میں کوئی تشنگی نہیں چھوڑی۔ ان کی تحقیق نے سوچ کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ان کی اس تحقیقی کاوش سے مقصود ہی یہ ہے کہ قوم اپنے مسلمات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حُسنِ تحریر

قارئینِ کرام سلام و رحمت!

اس سلسلۂ زرّیں میں اب ہم آپ کے سامنے، محترم پرویز صاحب کی وہ تحریر لاتے ہیں، جس کے لیے انہوں نے "آویزشِ حق و باطل" کا عنوان باندھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے اس اسوۂ حسنہ کو جس میں حرارتِ ایمانی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور طرزِ بیان عشق کے دردمند کا!

محمد عمر دراز

آویزشِ حق و باطل

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ازل سے تا امروز

قرآنِ کریم میں ہے کہ ابلیس کی نمود، تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی ہوئی ہے اور اسے قیامت تک کے لیے مہلت بھی دے دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر و شر کا تصادم اور حق و باطل کا تزاحم ناگزیر ہوگا۔ جہاں حق کی آواز اُٹھے گی، باطل کی فریب کاریاں اور رست خیزیاں اسے دبانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ جہاں کہیں "چراغِ مصطفویؐ" نور افشاں ہوگا "شرارِ بولہبی" اس سے ستیزہ کار نظر آئے گا۔ تغیّراتِ زمانہ سے اس تزاحم و تصادم کے انداز بدل جائیں گے لیکن اصلِ مخالفت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے گی۔ جنگ کے محاذ بدل جائیں گے، آلاتِ حرب و ضرب کی شکلوں اور نوعیتوں میں تبدیلی ہو جائے گی، لیکن حریفانِ پنجہ شکن وہی رہیں

گے، نہ فطرتِ اسد اللّٰہی" بدلیگی نہ قلبِ "مرحبی وعنتری" میں کوئی تغیر واقع ہوگا۔ وہی ابنِ آدم اور وہی جنودِ ابلیس۔ حضرت نوحؑ سے جناب عیسیٰؑ تک کے سلسلۂ رشد و ہدایت پہ ایک نگاہ ڈالیے، یہ سلسلۂ دراز کیا ہے؟ ایک داستانِ مسلسل ہے اسی تزاحم و تخالف کی۔ جہاں حق و صداقت کی آواز بلند ہوئی ابلیسی جیوش و عساکر اپنی پوری قوتوں کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لیئے سامنے آ گئے۔ ان ابلیسی جیوش و عساکر کی تفاصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہوں، اصولی طور پہ یہ دو بنیادی شقوں میں تقسیم ہوں گے۔ اور مزید تجزیہ کے بعد نظر آئے گا کہ یہ بنیادی شقیں بھی درحقیقت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ اس اصل کا نام، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "مترفین کا گروہ" ہے یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پہ عیش پرستی کی زندگی بسر کریں۔ غریب، مزدور، محنت کش خون پسینہ ایک کر کے کمائیں، اور یہ مختلف طریقوں اور متنوّع حربوں سے، ان کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر مزے اڑائیں۔ مفاد پرستوں کے اس گروہ کی ایک شاخ کا نام، ملوکیّت، سرمایہ داری جاگیرداری، زمینداری (اور دورِ حاضر کے جدید نظام کی رُو سے) صنعت کاری اور کارخانہ داری ہے اور دوسری شاخ، مذہبی پیشوائیت پہ مشتمل ہے۔ مقصد دونوں گروہوں کا ایک ہے —— یعنی غریب کمائیں اور یہ کھائیں۔ ان دونوں گروہوں کی آپس میں ملی بھگت ہوتی ہے اس لیئے کہ ایک کے بغیر دوسرا گروہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ برہمن راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دے کر عوام کو اس کی پرستش پہ آمادہ کرتا ہے اور راجہ برہمن کی رکھشا (حفاظت) کا ذمّہ لے کر اسے عوام کے قلب و دماغ پہ سوار رہنے کے قابل بناتا ہے۔ خدا کے رسولؑ آتے ہی اس لیے ہیں کہ مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان مفاد پرستوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر انہیں صحیح آزادی عطا کریں۔ ان کے خلاف، ان دونوں گروہوں کا اُٹھ کھڑے ہونا لازمی تھا۔ یہی ہے وہ کشمکش جو پہلے دن سے آج تک چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پہ شاہد ہیں کہ جہاں خدا کا کوئی رسولؑ آیا، اربابِ مذہب عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے ایک طرف صف آرا ہو گئے اور ارکانِ دولت و اقتدار استبداد و قہرمانی کے تمام حربات و آلات کو ساتھ لے کر دوسری طرف نبرد آزما۔ مدعیانِ حق کی تکذیب و تذلیل کی گئی۔ ان کی حق پرستی کا مضحکہ اُڑایا گیا۔ ان کی دعوتِ انقلاب کا استقبال استخفاف و استہزاء سے کیا گیا۔ ان کی انسانیت پرور تحریک کو کچلنے کے لیے ہر قسم کی تخویف و ترہیب سے کام لیا گیا۔ انہیں ان سے کہا گیا کہ اگر اپنی اس دعوتِ انقلاب سے باز نہیں آؤ گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۱۶)

لوگوں نے کہا" اے نوح! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اس دعوتِ انقلاب کو برابر جاری رکھے گا) تو (یاد رکھ) تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا"۔

کسی کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اپنی روش نہ بدلو گے تو جلاوطن کر دیئے جاؤ گے :-

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ۝

لوگوں نے کہا" اے لوط! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اپنی اس دعوت کو بند نہیں کرے گا) تو (یاد رکھ) تمہیں شہر بدر کر دیا جائے گا"۔

کہیں قسمیں اُٹھا اُٹھا کر فیصلے کیے گئے کہ اس جماعت کے تمام افراد کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ یہ ہر روز کی خلفشار ختم ہو :-

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۷/۴۹)

اُن (نو آدمیوں) نے کہا" ایک دوسرے کے سامنے خدا کے نام پر حلف اُٹھاؤ کہ ہم اچانک صالح اور اس کے ساتھیوں کو رات کے وقت قتا کے گھاٹ اتار دیں گے اور پھر اس کے ورثاء سے کہہ دیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ان کے خاندان کو تباہ و ہلاک کر دیا ہے اور یقیناً ہم (اپنے اس بیان میں) سچے ہیں"۔

کہیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس انداز کو نہیں بدلو گے تو زندہ آگ میں جھونک دیئے جاؤ گے :-

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ ۔۔۔۔ (۲۹/۲۴)

"تو ابراہیم کی قوم کا (اس کے سوا) کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے (یہ یوں باز نہیں آئے گا) اسے قتل کر ڈالو یا (آگ میں جلا دو)"۔

کہیں سرکشی و تمرّد کی تمام قوتیں مجتمع ہو گئیں کہ اس انقلابی تحریک کے بانی کا خاتمہ کر دیا جائے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ سامانِ ربوبیت صرف خدا کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔ انسانوں کے اقتدار میں نہیں :-

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ۔۔۔۔۔۔ (۴۰/۲۸)

"خاندان فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا "کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے (اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی جرم نہیں)"۔

قصۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے، حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش کردہ صداقت کو بے نقاب دیکھ لیا تو انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا اور ربّ موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ اس پر فرعون کی قہرمانیت پورے جوش میں آگئی اور اس نے گرج کر کہا کہ :-

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ○ (۲۰/۷۱)

فرعون نے کہا "تم بغیر میری اجازت کے موسیٰؑ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں باطل سکھایا ہے۔ اچھا، دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا، (یا ہتھکڑیاں بیڑیاں پہناؤں گا) اور کھجور کے تنوں پر سولی دونگا پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے، اور کس کا عذاب دیرپا ہے!"

اور، پھر اسی داستانِ بنی اسرائیل کے مقطع کے بند کو دیکھیے، جب خدا کی آخری حجّت نفسِ مسیحائی کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تاکہ اگر ان کے عروقِ مُردہ کچھ بھی صلاحیّت باقی ہو تو ان میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیا جائے۔ تو اس مقدّس کوشش کے جواب میں یہودیوں کے احبار و رہبان اور بازنطینی شاہنشاہیت کے عمائد و ارکان خرقہ و سجادہ کی دسیسہ کاریوں اور شمشیر و سناں کی آتش باریوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اس داعیٔ انقلاب کو حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔

غرضیکہ اگر آپ تاریخ کی رصد گاہوں سے نوعِ انسان کی داستانِ حیات کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ پوری داستان ایک حکایتِ مسلسل ہے کشمکشِ خیر و شر اور ستیزہ کاریٔ حق و باطل کی۔ جب اور جہاں حق کی آواز بلند ہوئی طاغوتی قوتیں، ہجومِ مخالفت کے ساتھ چاروں طرف سے اُمنڈ کر حلقہ گیر ہو گئیں۔ چنانچہ جب صدق و عدل کی یہی انقلاب آفریں آواز

وادیٔ فاران میں

فاران کی وادیوں سے بلند ہوئی تو ابلیسی جنود و عساکر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ یورش کر کے مقابلہ کے لئے صف آرا ہو گئے۔ اس مقابلہ کی سختی اور مخالفت کی شدّت کا اندازہ کرنے کے لئے عربوں کی ان نفسیاتی خصوصیات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سب سے پہلی چیز جو ان کے لئے قبولیتِ حق کی راہ میں حائل تھی ان کا قومی تفاخر اور قبائلی عصبیّت تھی۔ ابوجہل

نے برملا کہہ دیا کہ ہم نے ہر میدان میں بنو ہاشم کی برابری کی ہے اور انہیں کبھی آگے نہیں بڑھنے دیا لیکن اب یہ نبوت کو اپنے گھرانے میں لے آئے ہیں تو ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے اس دعوے کو سچا مان کر ان کی عظمت کو تسلیم کر لیں اور یوں ان کے خاندان کو اپنے خاندان سے زیادہ معزز و مکرم بنا دیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت، دلائل و براہین کی بنا پر نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ انہوں نے اس دعوتِ انقلاب کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا اور اسے حق کے خلاف پایا اس لئے اس سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار صرف تکبّر کی بنا پر تھا۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ (۳۸/۲)

"(کسی معقول بنا پر نہیں) بلکہ جو لوگ انکار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ جھوٹی عزت اور عداوت پر ایسا کئے ہوئے ہیں۔"

وجوہاتِ مخالفت

وہ کہتے تھے کہ اس شرف و مجد کے لئے یہی انسان کیوں منتخب ہوا ہے؟

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔۔۔ ۝ (۲/۱۰۵)

"اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ اور مشرکینِ مکہ، دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحیٔ الٰہی) نازل ہو۔"

ان کا اعتراض یہ تھا کہ خدا اس سے باتیں کرتا ہے، ہم سے کیوں نہیں کرتا؟

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَا اٰيَةٌ ۔ (۲/۱۱۸)

"اور جو لوگ (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکینِ عرب) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہ راست بات چیت کرے، یا اپنی کوئی (عجیب و غریب) نشانی بھیج دے۔"

وہ نہایت تکبّر اور غرور اور نفرت و حقارت سے کہتے کہ اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، ہم پر کیوں نہیں ہوتے؟

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۔ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝ (۲۵/۲۱)

"اور جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا کرنے کی توقع نہیں کرتے (یعنی آخرت کی زندگی کے منکر ہیں) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ براہِ راست خود ہم پر فرشتے اتار دیئے جائیں (جو خدا کی تعلیم ہم تک پہنچا دیں)، یا ہم خود اپنی آنکھوں سے

اپنے پروردگار کو دیکھ لیں (اور جو کچھ اسے ہم نے کہنا ہے وہ بلا واسطہ ہم سے کہہ دے)
حقیقت یہ ہے کہ یہ محض تکبر کی وجہ سے ہے جو یہ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور سخت قسم کی سرکشی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔"

اس آیت جلیلہ کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہ یہ تمام اعتراضات محض تکبر کی بناء پر کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کے فرد تھے اس لئے ان کے اس تکبر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شرفِ نبوت ذلیل خاندان کے حصہ میں کیوں آیا ہے بلکہ یہ کہ قریش کے مختلف گھرانے اپنے میں سے کسی کو بڑا نہیں سمجھتے تھے اس لئے اس امر کا تصور بھی انہیں سخت گراں گزرتا تھا کہ انہی میں سے ایک خاندان اسی طرح باقیوں پر سبقت لیجائے۔ یہ تھا وہ جذبۂ نخوت جو قبولِ حق کی راہ میں اس درجہ عناں گیر ہو رہا تھا۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ (۳۸/۸)

"(وہ لوگ ازراہِ عناد کہتے ہیں) کیا ہمارے درمیان میں سے (سب کو چھوڑ کر) صرف اسی پر ذکر (موعظت (قرآن) نازل کیا گیا ہے؟"

قبائلی تفاخر کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مال و دولت بھی وجہِ عزت و باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ اور، جیسا کہ پہلے سامنے آچکا ہے، حضورؐ کا شمار ان کے رؤساء میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اس چیز پر بھی اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے:۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (۴۳/۳۱)

"اور وہ لوگ (ازراہِ اعتراض یہ بھی) کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف کے سرداروں) میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کر دیا جاتا (جو دولت و ثروت کے لحاظ سے معزز ہوتا)۔"

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، جس انقلاب کی دعوت رسولوں کی طرف سے دی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریبوں، ناداروں، کمزوروں اور مظلوموں کو، طاقتوروں اور دولت مندوں کے پنجۂ خونیں سے چھڑایا جائے۔ لہٰذا، ظاہر ہے کہ اس دعوت پر سب سے پہلے، غریبوں کا طبقہ لبیک کہے گا۔ آپ قرآن میں بیان کردہ، اوّلین دعوت کو دیکھئے۔ حضرت نوحؑ کی جماعت کے متعلق سردارانِ قوم کا یہ حقارت آمیز طعن ہمارے سامنے آتا ہے کہ:۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا

مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ (۱۱/۲۷)۔

"اس پر قوم کے اُن دولت مند سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو، اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں، اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔"

نفرت وحقارت

یہی کیفیت قرآنی تحریکِ انقلاب کی تھی۔ جو سعید روحیں سب سے پہلے جماعتِ مؤمنین میں شامل ہوئیں ان میں اکثریت غرباء ہی کی تھی، اس لئے اکابر قریش انہیں بنگاہِ حقارت دیکھتے اور طنزاً کہتے کہ:۔

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۝ (۶/۵۳)

"کیا یہی ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ نے ہم میں سے اپنے بذل واحسان کے لئے چن لیا ہے؟"

نہ صرف ذلیل ہی بلکہ اُنہیں سفیہ (بیوقوف) بھی کہتے:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (۲/۱۳)

"اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ (اپنی مفسدانہ روش سے باز آجاؤ۔ اور راست بازی کے ساتھ) ایمان کی راہ اختیار کرو جس طرح اور لوگوں نے اختیار کی ہے، تو کہتے ہیں، کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جسطرح (یہ) بے وقوف آدمی ایمان لے آئے ہیں۔"

بشریت پر اعتراض

نبیؑ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ، خدا سے ہم کلام ہونے کے باوجود، عام انسانوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی امتیازی خصوصیت (وحی کے بعد) اس کی سیرت کی بلندی ہوتی تھی۔ لیکن مذہبی پیشوائیت، عوام کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتی تھی کہ نبیؑ عام انسانوں سے الگ تھلگ، ایک عجیب قسم کی محیر العقول ہستی ہوتی ہے۔ اس سے قدم قدم پر معجزے سرزد ہوتے ہیں۔ اس کی ہر بات خارقِ عادت اور خلافِ فطرت ہوتی ہے۔ فرشتے اس کے جلو میں چلتے ہیں۔ اس سے پتھر باتیں کرتے ہیں۔ پہاڑ اس کے اشارے پر کانپنے لگ جاتے ہیں، وہ خشک زمین سے تروتازہ پھل اُگا دیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ سے سینکڑوں بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اس کی ایک آواز پر مُردے جی اٹھتے ہیں۔ اربابِ مذہب، خدا کے رسولوں کے متعلق اس قسم کا تصور عوام

کے ذہن میں پیوست کر دیتے تھے۔ اور جب رسولؐ، ان کے اس تصور پر پورا نہیں اُترتا تھا وہ اسے جھٹلاتے تھے۔ تنگ کرتے تھے۔ اس کا مزاق اڑاتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۰/۲)۔

"کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی ہے؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دے، اور ایمان والوں کو خوش خبری دیدے کہ پروردگار کے حضور اُن کے لئے اچھا مقام ہے اسی لئے کفار کہتے ہیں کہ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے"

دوسری جگہ ہے:۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ (۳۸/۴)

"اور لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ان کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (رسولؐ) اُنہی میں سے (کیسے) آگیا؟ اور (اس بناء پر) منکرینِ دعوت کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے"

سورۂ قٓ میں ہے:۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ (۵۰/۲)۔

"(یہ لوگ کسی دلیل و برہان سے انکار نہیں کر رہے) بلکہ انہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (یعنی رسولؐ) انہی میں سے (کیسے) آگیا۔ چنانچہ منکرینِ دعوت کہتے ہیں کہ یہ تو عجیب سی بات ہے (جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی)۔

اسی کہنہ اعتراض کی صدائے بازگشت کہ رسول مافوق البشر ہونا چاہیئے:۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷/۹۴)

"اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو اس بات نے لوگوں کو

ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہوکر) کہنے لگے "کیا اللہ نے (ہماری ہی طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے؟"

مخالفین کے سرغنے، خفیہ سازشوں میں اسی اعتراض کو پیش کرکے عوام کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتے تھے:۔

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ (۲۱/۳)

"یہ مخالفین جو اس طرح سرکشی پر اُترے ہوئے ہیں سرگوشیاں کرتے ہیں اور عوام سے کہتے ہیں کہ "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ جاتے ہو جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ رسول کو تو "خدا کا اوتار" اور "الوہیت کا مظہر" ہونا چاہیئے!

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ (۲۵/۷)

"یہ لوگ کہتے ہیں "اس رسول کو کیا ہو گیا کہ وہ (عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ (اس میں اور عام انسانوں میں فرق ہی کیا ہے؟) ایسا کون نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ اُترتا جو اس کے ساتھ ساتھ (لوگوں کو انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتا"

وہی اسلاف پرستی

یہ تو تھا رسولؐ کے متعلق۔ باقی رہا اس کا پیغام۔ سو اس کی مخالفت میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ ہزار دلیلوں کی ایک دلیل اور لاکھ براہین کی ایک برہان یہ تھی کہ یہ تعلیم ہمارے آباؤ اجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ وہی "دلیل" جس نے نوعِ انسانی کو علم و بصیرت کی راہوں پر گامزن ہونے سے ہمیشہ روکا۔ وہی "برہان" جس کی وجہ سے انسان کے تفکر و تدبر کی قوتوں پر ہمیشہ جمود و تعطل کا فالج گرتا رہا۔ وہی تقلیدِ اعمیٰ (بریفالٹ کے الفاظ میں CUSTOM THOUGHT) جس نے انسانیت کو ارتقائی مدارج طے کرنے سے ہمیشہ باز رکھا۔ وہ جذام جس کے مہلک جراثیم، دین و دانش کے جسدِ صالح کی ہلاکت میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے۔ وہ نگہ فریب شخصیت پرستی جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حجابِ اکبر بن کر حائل رہی۔ یعنی ابلیس کا وہ حربہ جس سے اس نے ابنِ آدم کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم سے ہمیشہ گمراہ کیا۔ قرآن، علم و بصیرت اور عقل و

دانش کی دعوت تھی لیکن مذہبی پیشوائیت کے نزدیک آنکھیں بند کر کے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے جانا ہی مسلکِ حق و صداقت تھا:-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۷۰)

"اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو (اور خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لو) تو کہتے ہیں، نہیں، ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے (افسوس ان کی بے دانشی و جہالت پر!) کوئی ان سے پوچھے، اگر تمہارے اسلاف عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں، تو تم پھر بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے؟"

سورۂ مائدہ میں ہے:-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۵/۱۰۴)۔

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے، (عقل و بصیرت کی) اس بات کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے نیز اللہ کے رسول کی طرف رجوع ہو تو کہتے ہیں، ہمارے لئے تو وہی طریقہ بس کرتا ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے" (ان سے پوچھو کہ) اگر ان کے باپ دادا کچھ جانتے بوجھتے نہ ہوں اور راہ راست پر بھی نہ ہوں (تو کیا وہ پھر بھی انہی کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے؟)"

وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے (اور مسلکِ تقلید میں اس کی ضرورت سمجھی ہی نہیں جاتی) کہ جس ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اس کے متعلق کبھی اتنا تو سوچ لیا جائے کہ وہ فلاح و سعادت کی جنت کی طرف لئے جا رہی ہے یا ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف:-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ (۳۱/۲۱)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت) کی پیروی کرو جو اللہ نے (اپنے رسول پر) نازل کی ہے تو کہتے ہیں (نہیں) ہم تو اس راہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو چلتے ہوئے پایا ہے۔ (ان سے پوچھو کہ) اگر (اس طرح) شیطان انہیں جہنم کے عذاب کی طرف بلاتا رہے۔ (حتیٰ کہ وہ جہنم کے یقینی مستحق ہو جائیں تو کیا پھر بھی وہ اسی

راہ پر چلتے رہیں گے ؟"

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا سارا مدار، اسلاف کی پرستش پر ہے۔ وہ پہلے اسلاف کی عظمت لوگوں کے دل میں راسخ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد، اپنے آپ کو، ان اسلاف کی عظمت کے محافظ اور ان کے مسلک کے نگہبان کی حیثیت سے پیش کر کے لوگوں سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔ جس مسلک کی دعوت، رسولوں کی طرف سے دی جاتی تھی، اس میں، ان مذہبی پیشواؤں کی مفاد پرستیوں پر براہِ راست زد پڑتی تھی۔ وہ یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ ہم اس دعوت کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ہماری روٹی چھنتی ہے۔ نہ ہی وہ علم و بصیرت کی بنا پر اس کی تردید کر سکتے تھے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں، تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھ میں یہ بڑا مؤثر حربہ تھا۔ حتیٰ کہ اگر ان کی کسی بدیہی غلط روی کی طرف ان کی توجہ دلائی جاتی، اور ان سے کہا جاتا کہ اس قسم کی بات، تعلیم خداوندی کی نہیں ہو سکتی، تو وہ یہ جواب دیتے کہ یہ بات ہمارے اسلاف سے اسی طرح چلی آ رہی ہے اور چونکہ ہمارے اسلاف، تعلیم خداوندی کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے اس لئے خدا کا حکم اسی قسم کا ہوگا۔ سورۂ اعراف میں ہے:۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۷/۲۸)۔

"اور یہ لوگ جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں، تو کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور (چونکہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں اس لئے) خدا نے ایسا ہی کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے۔ (اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو کہ خدا کبھی بھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟"۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جن لوگوں کی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی انہیں عقل و فکر کی بنا پر تعلیم خداوندی کی دعوت دینا کس قدر مشکل کام تھا!

لیڈروں کے حربے

آپ تاریخ کے صفحات پر نگاہ ڈالئے یا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سوسائٹی میں ایک طبقہ تو عوام (MASSES) کا ہوتا ہے اور دوسرا خواص یعنی لیڈروں کا۔ قوت، عوام میں ہوتی ہے لیکن اُن کی مہار، خواص کے ہاتھوں میں۔ خواص کی ذہانت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ عوام کو کس حد تک اپنے ہاتھوں میں رکھ سکتے ہیں۔ بس یہی خواص کی کاریگری اور ہوشیاری ہے۔ سورج کی آنکھ نے جو کچھ اس کرۂ ارض پر دیکھا ہے اگر اس کی فلم تیار ہو سکے

تو آپ دیکھیں گے کہ عقلِ انسانی کی تمام تگ و تاز اسی میں صرف ہوتی رہی ہے کہ عوام کو کس طرح قابو میں رکھ کر انہیں اپنی اغراض و مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنایا جائے۔ جو اس فن میں زیادہ ماہر ہے وہی صاحبِ اقتدار و ذی وجاہت ہے۔ عوام کو ہاتھ میں رکھنے کے لئے ذہنِ انسانی کی ابلیس کاری نے عجیب و غریب حربے ایجاد کئے ہیں۔ کہیں استبدادِ شاہنشاہیت کا وہ آہنی پنجہ جو جسم اور دماغ دونوں کی آزادی کا گلا گھونٹ دے اور کہیں تقدسِ برہمنیت کا وہ کچا دھاگہ (زُنّار) کہ جس کی گرفت فولادی زنجیر وں سے بھی زیادہ پائیدار ہو۔ کہیں سلطانی کی "ظلِّ الٰہیت" اور کہیں درویشی کی "عرش آشیانیت"۔ اور ان تمام دل کش و حسین پردوں کے پیچھے کارفرما جذبہ، وہی حصولِ جاہ و حکومت اور فروغِ اقتدار و سطوت۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ان کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے طبقۂ خواص کے بھی سخت خلاف ہے جو عوام کو اپنا آلۂ کار بنا کر، حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک، حکومت کا حق، خدا کے علاوہ اور کسی کو نہیں، لہٰذا، جس تحریک کے داعی حضرات انبیاء کرامؑ تھے، اس کی مخالفت اس طبقہ کی طرف سے بھی بڑی شدت سے ہوتی تھی۔ اور اس کے لئے وہ وہی حربے استعمال کرتے تھے جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ یعنی وہ عوام کو طرح طرح سے بھڑکاتے اور ان کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے تاکہ وہ سیلابِ بلا کی طرح اُٹھیں اور اس تحریک کو اپنی طغیانیوں میں بہا کر لے جائیں۔ اور چونکہ عقائد، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اس لئے وہ عوام کو مشتعل کرنے کے لئے سب سے پہلے اُن کی اسی دُکھتی رگ کو پکڑتے۔ وہ نہایت مصلحانہ انداز اور دردمندانہ پیرایہ میں ان سے کہتے کہ دیکھو! یہ شخص تمہیں اس دین سے برگشتہ کر رہا ہے جو تمہارے بزرگانِ کرام اور اسلافِ عظام کی طرف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اگر اس کی قوت بڑھ گئی تو تمہارا مذہب خطرہ میں پڑ جائے گا۔ تم مرتد ہو جاؤ گے۔ الحاد و بے دینی کی موت مرو گے

یہی فرعون نے کیا

فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی آویزش میں دیکھئے۔ فرعون اتنی بڑی قوت کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود اُسے عوام کے اسی کمزور پہلو سے فائدہ اُٹھانا پڑا۔ اس نے ان سے کہا کہ:-

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ (۴۰/۲۶)

"اور فرعون نے (اہلِ دربار سے) کہا "تم مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو۔ وہ (اپنی امداد کے لئے) اپنے پروردگار کو پکارے! مجھے ڈر ہے کہ اگر اسے یوں ہی زندہ چھوڑ دیا گیا، تو وہ تمہارے

دین کو بدل دے گا یا پھر (سر) زمین (مصر) میں فساد برپا کر دے گا (جسے بعد میں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا)۔"

اور یہی اکابر مکہ نے

یہی حربہ سرزمین عرب کے فراعنہ نے استعمال کیا:۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًی ؕ (۳۴/۴۳)

"اور (دیکھو) جب ان کے سامنے ہمارے واضح احکام پیش کئے جاتے ہیں تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ شخص (محمدؐ) اس کے سوا کیا ہے کہ (ہماری ہی طرح کا) ایک آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ان معبودوں کی پرستش سے روک دے جنہیں تمہارے آباؤ اجداد پوجتے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ (کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خدا کا حکم ہے) اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ (خدا کے نام پر) تہمت باندھا ہوا ایک جھوٹ ہے۔"

یہ ہیں "اکابر مجرمین" کی وہ چالیں جو اس انسانیت بخش تحریک کے خلاف چلی جاتی ہیں:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا لِیَمْكُرُوْا فِیْهَا ؕ وَمَا یَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (۶/۱۲۳ نیز ۲۵/۳۱)۔

"اسی طرح، ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا ہو جاتے ہیں جو اس تحریک کے خلاف عجیب و غریب چالیں چلتے ہیں۔ حالانکہ یہ چالیں خود ان کے اپنے خلاف ہوتی ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔"

ان کی طرف سے یہ مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ اس لئے کہ ان کے پاس مال و دولت کی کثرت تھی اور ان کا خاندانی جتھہ بھی بہت بڑا تھا:۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیْنَ ۝ (۶۸/۱۴)

"یہ (تمام سرکشی و عدوان) اس وجہ سے ہے کہ وہ مال اور اولاد والا تھا۔"

قوت و دولت کے نشہ میں

جب ان سے کہا جاتا کہ جو روش تم نے اختیار کر رکھی ہے اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم تباہ اور برباد ہو جاؤ گے تو وہ کہتے کہ ہمارے پاس اس قدر دولت ہے اور ہمارا جتھہ بھی اس قدر مضبوط ہے، اسلئے ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ہم کیسے تباہ ہو جائیں گے؟

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ (۳۴/۳۵)۔

"اور ان لوگوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہمارے پاس بہت زیادہ مال و دولت اور کثیر تعداد اولاد ہیں

ہیں (جن سے ہم اپنی مدافعت کر سکتے ہیں) اور ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا"

مترفین کا گروہ

یہی ہے "مُترفین" کا وہ گروہ جس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے "مُترفین" سہل انگار تن آسان، عشرت پسند۔ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والے۔ خواہ وہ اُمراء و رؤسا کا طبقہ ہو کہ جن کے قصرِ تعیش کی رنگینی کا سامان، مزدور کے پسینہ اور خون سے بہم پہنچتا ہے اور خواہ اربابِ مذہب و "رُوحانیت" کا حلقہ ہو جن کی مسندِ الوہیت کے پائے، سادہ لوح عوام کے جذباتِ اطاعت کے کندھوں پر استوار ہوتے ہیں۔ یہی ہے وہ طبقہ جو اس انقلابی تحریک کی مخالفت اس شد و مد سے کرتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۳۴/۳۴)

"اور (دیکھو) ہم نے (کبھی) کسی انسانی آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کرنے والا (رسول) نہیں بھیجا مگر (ہمیشہ) اس (بستی) کے مفاد پرست طبقہ کی طرف سے یہی کہا گیا کہ جس دین کو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اُسے ماننے والے نہیں ہیں"

اور اس مخالفت میں دلیل وہی عوام فریبی کی پیش کرتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۳)

"اور (اے پیغمبر! جس طرح آج اہلِ مکہ کے سردار تیری مخالفت میں سرگرم ہو رہے ہیں) اسی طرح تجھ سے پہلے بھی ہم نے کسی (انسانی) آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کرنیوالا رسولؐ نہیں بھیجا مگر (ہمیشہ) اس کے مفاد پرست طبقہ نے یہی کہا کہ ہم (اس نئے دین کو نہیں مانتے۔ ہم) نے تو اپنے بڑے بوڑھوں کو ایک طریقہ پر (عمل کرتے) پایا ہے اور یقیناً ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں"۔

تقدیر کا بہانہ

اور اگر یہ گروہ کسی وقت اس طرح گھِر جاتا ہے کہ اسے کوئی اور راہِ فرار نہیں سوجھتی تو پھر تقدیر کا بہانہ سامنے لے آتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝ (۴۳/۲۰، ۶/۱۴۸)

"اور وہ کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان معبودوں کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار ہی نہ کرتے (اس نے چاہا جب ہی تو ہم نے ایسا کیا) انہیں اس بات کا کچھ بھی علم نہیں (کہ خدا اس کا ذمہ دار نہیں۔ بلکہ ان کا اپنا ارادہ اور عمل اسکا ذمہ دار ہے) اسکے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگ قیاسی گھوڑے دوڑا رہے ہیں"!

معراج انسانیت ص ۱۱۵-۱۰۱

(مسلسل)

محترم محمد اسلام کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حکمرانی اور قانون سازی کا حق کس کو حاصل ہے؟

اسلام میں حکمرانی اور قانون سازی کے اصول کے سلسلے میں طلوع اسلام نے جو قرآنی نظریہ پیش کیا ہے وہ مختلف عنوانات کے تحت ہزارہا اوراق پر پھیلا ہوا ہے۔ اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اس اصل الاصول میں احترام آدمیت اور انسانی مساوات کا راز پوشیدہ ہے۔ اطاعت صرف قانون خداوندی کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں، حکومت کا حق صرف اس حاکم الحاکمین کے ضابطۂ قوانین کو حاصل ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) قرآن کریم میں جو اصول اور قوانین بیان کئے ہوئے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں، ان میں کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ البتہ اس کے بیان کردہ اصول کی جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ ان جزئیات کے مرتب کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اسلامی مملکت ایک مجلس مشاورت مقرر کرے گی جو ان امور پر غور و خوض کے بعد قرآن کریم کی کلی تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے جزئی قوانین مرتب کرے گی۔ ان جزئی قوانین کو جب مملکت کی مرکزی اتھارٹی نافذ کرے گی تو ان کی حیثیت شرعی قوانین کی ہو جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشاورت سے طے پا جائے گا وہ احکام خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو وہی مجلس مشاورت جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد، یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلس مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہو گی۔ اسطرح حدود اللہ تو اپنے مقام پر محکم اٹل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا، وہ قابل تغیر و تبدل ہوگا۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔

عہد کہن سے عصر حاضر تک انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:۔

انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے، جس کی وجہ سے اس کے لئے مل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس

کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے، جو ان کے متنازعہ فیہ معاملہ میں تصفیہ کرادے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے، اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا، جسے نظامِ حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پنچایت کی سی تھی، لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی باقاعدہ ثالث کی ضرورت پیش آئی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قولِ فیصل قرار دیا جاتا تھا۔ اور اس سے سرکشی مستوجبِ سزا ہوتی تھی۔ بالفاظِ دیگر اس میں جملہ افرادِ معاشرہ، اپنے ہی جیسے ایک انسان کے محکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مُراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلا نہ جائے وہ کارفرما رہے۔ اُس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ جو ہم نظامِ حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں تو یہ درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے، جس کی رُو سے وہ طے کرتا ہے کہ قانون سازی کے اختیارات کسے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل جمہوریت ہے۔ لیکن عہدِ کہن کی شخصی حکومت ہو یا عصرِ حاضر کی جمہوریت، اسمیں انسان بہرحال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترامِ انسانیت اور شرفِ آدمیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔

قرآن کا انقلابی تصور

اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا حکم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون، بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترامِ انسانیت کے منافی، اس نے یہ انقلاب آفرین اعلان کیا کہ:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۸)

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین، اختیارِ حکمرانی حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔"

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ شرفِ انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالا کسی ہستی کو ہو۔ اسی ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔

جولوگ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں انہیں مومن، یعنی خدا پر ایمان لانے والا کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)

خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے، اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے محترم پرویزؒ صاحب نے لکھا:-

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے، وہ ہر فرد کو براہِ راست تو کوئی حکم دیتا نہیں، نہ ہی ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ تو پھر اس کی اطاعت کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کا جواب بھی صاف اور واضح ہے، یعنی اللہ جن قوانین کی اطاعت چاہتا ہے وہ اس نے بوساطت جناب نبی اکرمؐ انسانوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ انہی قوانین وضوابط کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار وضاحت کر دی کہ اس کی اطاعت، قرآنی نظام کی اطاعت ہوگی۔ لہٰذا اسلامی نظامِ حکومت کی اساس قرآن کی اطاعت ہے، حکومت اسی کے مطابق کی جائے گی۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "انہیں قرآن کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے حکومت قائم کرو" جو ایسا نہ کرے اُسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) "جو قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم نہ کرے تو وہ کافر ہیں"

قرآن کا انداز

قرآن کریم خدا کی طرف سے آخری کتاب ہے جو انسانوں کو دی گئی ہے۔ اب غور کیجئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے لے کر (کہ جب قرآن نازل ہوا) قیامت تک کس قدر زمانے آئیں گے اور ان زمانوں میں کس قدر مختلف طبقات کے لوگ ہوں گے۔ قرآن، تمام نوعِ انسانی کے لئے تمام زمانوں کے لئے، خدائی حکومت کا جامع ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں کی تمدنی زندگی (SOCIAL LIFE) کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں کے طریقِ بود و ماند اور اسلوبِ معاش و معاشرت بدلتے رہتے ہیں۔ آج ذرائع آمد و رفت کی وسعتوں سے ساری دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں جس سے انسانوں کے بین الاقوامی روابط و معاملات اس نہج و انداز کے ہو گئے ہیں کہ ہزار سال قبل اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج دنیا کی کوئی قوم خود مکتفی (SELF SUFFICIENT) اور دوسروں سے مستغنی (INDEPENDEET) نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ عصرِ حاضر کے تمدنی تقاضے ازمنۂ سابقہ کے تقاضوں سے مختلف ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں، جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے لہٰذا ان میں مرورِ زمانہ سے تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انسان کی طبعی زندگی کو لیجئے۔ جس طرح چھٹی صدی عیسوی کے زمانے کے انسان کی پیاس پانی سے

بجھتی تھی، اسی طرح آج کے انسان کی پیاس کی تسکین بھی پانی ہی سے ہوتی ہے۔ یا جہانِ ذوق ونظر میں جس طرح نزہت ولطافت ہزار پہلے کے انسان کے لئے وجہِ شادابیٔ قلب ونگاہ تھی، اسی طرح آج کے انسان کے لئے باعثِ شگفتگیٔ دیدۂ ودل ہے۔ اسی اصول کے تابع جس طرح صداقت وشرافت ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے باعثِ فخر ومباہات تھی، اسی طرح آج کے انسان کے لئے بھی وجہِ تکریم وتفضیل ہے۔ ان چیزوں پر زمانے کی تبدیلی سے کچھ اثر نہیں ہوتا لہٰذا ظاہر ہے کہ:۔

(۱) انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متأثر نہیں ہوتے اور مرورِ وقت سے ان میں تغیر وتبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) لیکن اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا، جس ضابطۂ قوانین وضوابط کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے، نظامِ زندگی بننا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان دو تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کسی خاص وقت کے لئے نظامِ زندگی بن سکے گا۔ چونکہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔ (دین کے معنی ہی نظامِ حیات ہیں) جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور زمان ومکان کی تقیدات سے ماوراء، اس لئے اس میں انسانی زندگی کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں:۔

(۱) بعض اُصول ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن پر مرورِ زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر وتبدل ہوں گے۔ ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں۔

(۲) باقی اصول ایسے ہیں جن کی صرف حدود متعین کر دی گئیں ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان کی جزئیات ہر زمانے کے انسان اپنی اپنی ضروریات (یعنی اپنے زمانے کے تقاضوں) کے مطابق خود متعین کریں گے، اس شرط کے ساتھ کہ یہ جزئیات ان حدود سے متصادم نہ ہوں۔

مثلاً قرآن میں زانی، سارق، ڈاکو، باغی کی سزا متعین ہے۔ وصیّ کی تفصیل موجود ہے۔ جب کوئی انسان بلا وصیت مرجائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو تو تقسیم ترکہ کے حصے مقرر ہیں وَقس علیٰ ھذا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کے تعین سے منشاءِ خداوندی یہی ہے کہ ان میں تغیر وتبدل نہیں ہوگا... دوسری طرف مثلاً نظامِ اقتصادیات میں قرآن نے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ روپیہ کی گردش اس طرح ہونی چاہیئے کہ وہ محض اُوپر کے طبقے میں ہی نہ پھرتا رہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷) یہ ایک محکم اصول ہے جو بطورِ اُصول، قیامت تک کے لئے کارفرما رہ سکتا ہے۔ لیکن وہ جزئی قواعد جن سے

یہ مقصد حاصل ہو، مختلف زمانوں میں بدلتے رہیں گے اس لئے قرآن نے ان کی تفاصیل و جزئیات سے بحث نہیں کی۔ یا مثلاً محاصلِ حکومت (GOVERNMENT REVENUES) کے سلسلے میں اس نے زکوٰۃ کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن سارے قرآن میں دیکھ جائیے، کہیں بھی اس کی شرح (RATE) مقرر نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ شرح، مختلف زمانوں میں حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہے گی۔ زکوٰۃ کی شرح کو بلا تعین چھوڑ دینے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ منشاءِ خداوندی یہی ہے کہ اس کی شرح، حکومتِ اسلامی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کرے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کے اصول کی طرح، اس کی شرح بھی ناقابلِ تغیر ہوتی تو قرآن نے جہاں اتنی مرتبہ زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے، وہاں ایک آدھ آیت میں اس کی شرح کا تعین بھی کر دیتا، اللہ کے لئے یہ کونسی مشکل بات تھی؟

پہلی قرآنی حکومت

قرآن نازل ہونے کے بعد سب سے پہلی حکومتِ خداوندی نبیٔ اکرمؐ نے متشکل فرمائی، اس کے لئے حضورؐ نے:-

(۱) ان احکامات کو بجنسہٖ نافذ فرمایا جو قرآن میں بالتفصیل آئے ہیں، یعنی جن کی جزئیات قرآن نے متعین کر دی ہیں اور

(۲) جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، ان کی جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین فرمائیں۔ اس زمانے میں ہنوز تمدنی وسعت اتنی زیادہ نہ تھی جو مختلف النوع معاشرتی اقتصادیات کا موجب بنتی۔ وہ سیدھا سادہ دور تھا اس لئے اس میں تفصیلی احکام کی اتنی کثرت نہ تھی جیسی بعد میں جا کر ہوئی۔ لہٰذا حضورؐ کی متعین فرمودہ جزئیات بھی کچھ زیادہ نہ تھیں۔

ان ہی دونوں کے مجموعے کا نام شریعتِ اسلامی یا ضابطۂ قوانینِ حکومتِ خداوندی تھا۔ اسی ضابطہ کی اطاعت حکومتِ حقہ کی اطاعت یعنی خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔

نبیٔ اکرمؐ نے قرآنِ کریم کو نہایت محفوظ شکل میں لکھوا کر، اور حفاظ کو حرف بہ حرف یاد کرا کر اور ان کا یاد کیا ہوا خود سن کر، اُمت کے حوالے کر دیا۔ اور خود اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹) "ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ و نگہبان ہیں"۔ باقی رہیں جزئیات جو شق ۲ کے مطابق حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر خود متعین فرمائی تھیں، چونکہ وہ ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے متعین نہیں کی گئی تھیں، اس لئے حضورؐ نے نہ ان جزئی احکامات کو کہیں قلم بند کرایا نہ انہیں کسی کو حفظ کرایا اور نہ ہی کسی ایسے مجموعے کو مدوّن کرنے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ کتبِ تاریخ و آثار اس پر شاہد ہیں کہ نبیٔ اکرمؐ نے قرآن کے سوا اُمت کو اور کوئی مجموعۂ احکام نہیں دیا۔

اور مذکورہ صدر تصریحات کی روشنی میں اس کی ہم بھی صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ :-

"جن اصولوں کی جزئیات کو ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل رکھنا منشائے خداوندی نہ تھا اُن جزئیات کو ابدی طور پر غیر متبدل رکھنا منشائے نبی اکرمؐ کس طرح ہو سکتا تھا"؟

نبیٔ آخر الزمان کے دورِ مبارکہ کے بعد، حضورؐ کے جانشین خلفائے راشدینؓ کے ادوار میں حدود اللہ کے مطابق جزئی قوانین کی تدوین اور ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے محترم پرویزؒ صاحب نے تحریر فرمایا :-

"رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے (خلیفہ کے معنی جانشین ہیں)، اب قرآنی اصولِ حکومت کے مطابق، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مترادف ہو گئی۔ چونکہ آپ کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں بُعد نہیں تھا اور دونوں کے تمدنی مقتضیات ایک ہی تھے، اس لئے عام طور پر نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلیوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لیکن بایں ہمہ جن معاملات میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوئی، ان میں تبدیلی بھی کی گئی۔ اور جو نئے امور و قضایا سامنے آئے۔ ان میں نئے فیصلے بھی دیئے گئے۔ کتبِ روایات و آثار میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ نے ایسے فیصلے صادر کئے جو نبی اکرمؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں سے مختلف تھے۔ امورِ مملکت میں سب سے اہم معاملہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ حضورؐ نے نہ کسی کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا نہ نامزد۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور حضرت عمرؓ نے انتخاب کو چھ حضرات میں محدود کر دیا۔ یہ فیصلے ظاہر ہیں کہ رسول اللہؐ کے فیصلے سے مختلف تھے یا مثلاً حضرت عثمانؓ نے جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا۔ اسی طرح شراب نوشی کی سزا کا تعین نہ قرآن میں ہے اور نہ حضورؐ کے زمانے میں اس کی تعین ہوئی، اسے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے متعین کیا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کتبِ آثار میں ہے کہ آپ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیں تو وہ طلاق بائنہ مان لی جائے گی، تو آپ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ ایسی طلاق کو بائن قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے نافذ قرار دیا اور فرمایا کہ لوگوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے، اس کے پیشِ نظر اب یہی حکم مناسب ہے۔ چنانچہ یہ حکم نافذ العمل ہوا۔ اور شریعت کا حکم قرار پا گیا۔ یعنی رسول اللہ کے زمانے میں ایک حکم، حکمِ شریعت تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں، اس کے برعکس دوسرا حکم، حکمِ شریعت قرار پا گیا اور اس وقت اسی حکم کی اطاعت اطاعتِ خدا اور رسولؐ مانی گئی۔

خلیفہ کے فیصلے کے خلاف دوسرے خلیفہ کا فیصلہ

خلافت راشدہؓ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے خلاف دوسرے

فہ نے فیصلہ دیا ہو۔ مثلاً۔

) قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں

..... نبی اکرمؐ نے اقرعؓ بن حابس اور عیینہ بن حصن کو (جو اُمرائے قبائل میں سے تھے) ایک بار

یفِ قلوب کے لئے سو سو اُونٹ عطا فرمائے۔ پھر خلیفہ اوّل کے عہد میں انہوں نے کچھ زمینیں طلب

ں تو انہیں وہ بھی دے دی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس اراضی کو یہ کہہ کر واپس لے

یا کہ اللہ نے اسلام کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دیا ہے، اس لئے وہ زمینیں اب ان کے حقداروں

دی جائیں گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مطلقہ عورت نے اپنی عدّت کے زمانے میں نکاح کر لیا (حالانکہ قرآن میں

س کی ممانعت آئی ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو کوڑے لگوائے اور فیصلہ صادر فرمایا کہ جو

ورت اپنی عدّت کے زمانے میں نکاح کرے اور اس کے شوہر کی اس کے ساتھ مقاربت نہیں ہوئی تو دونوں

یں علیحدگی کرا دی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ شوہر اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقاربت ہو

چکی ہے تو اس علیحدگی کے بعد وہ اس سے نکاح نہیں کر سکے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کے جزو ثانی

سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ بعد اختتام عدّت اس شوہر سے نکاح جائز ہو گا خواہ مقاربت ہوئی ہو یا نہ۔

(۳) حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت، غلام کی بیوی ہو کر صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر

حرام ہو جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں

ہو گی۔

(۴) اگر کوئی مرد حالتِ مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق اس عورت

کو متوفّی کے ترکہ سے اسی صورت میں حصہ ملے گا کہ اس کا خاوند عدّت کے زمانے میں فوت ہو جائے۔

اگر عدّت کی مدت گزر جائے تو پھر متوفّی کے ترکہ سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے فیصلہ دیا

کہ اس باب میں حد مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہر حال ترکہ کی مستحق ہو گی۔

(۵) جس حاملہ عورت کا شوہر مر جائے حضرت عمرؓ نے اس کی عدّت وضعِ حمل مقرر کی۔ لیکن حضرت علیؓ

کا فیصلہ ہے کہ وضعِ حمل اور چار مہینے دس دن کی مدت میں جو نسی مدت طویل ہو گی وہی اس کی عدّت ہے۔

(۶) دادا کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دلواتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی

حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(۷) حضرت ابوبکرؓ لوگوں پر برابر مال تقسیم کراتے تھے اور کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے یہی رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو حضورؐ کے ساتھ شریکِ جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو مٹا دیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتبِ تاریخ و آثار میں مذکور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ کی متعین کردہ جزئیات کو ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانے کے لئے شریعت ہوتا تھا، اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانے والوں کیلئے شریعت۔

ازاں بعد

خلفائے راشدینؓ کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ دین اور دنیا کی تفریق تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ بادشاہوں نے (جو اپنا نام خلیفہ ہی رکھتے تھے) "امورِ دنیا" کی سرانجام دہی کا فریضہ اپنے ذمہ رکھا اور "امورِ دینی" فقہائے کے سپرد ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی نظام کا وہ اصل الاصول جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بتدریج نگاہوں سے اوجھل گیا۔ شریعت کا جزئیات متعین کرنے کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ ملت کا اجتماعی منصب تھا، جس کی تکمیل مجلس شوریٰ اور امیرِ ملت کے فیصلوں سے ہوتی تھی۔ اب نہ امیرِ ملت تھا نہ اس کی مجلس شوریٰ، اس لئے جزئیات کا تعین کس طرح ہوتا؟ ... اب لوگ فقہاء کے پاس اپنے اپنے امور و قضایا لاتے۔ وہ پہلے قرآن کی طرف نگاہ دوڑاتے۔ اگر اس کی متعین کردہ جزئیات سے بات طے ہو جاتی تو ہوالمراد، ورنہ وہ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافت راشدہ کے فیصلوں میں تفحص کرتے۔ اور اگر وہاں بھی مناسب حال کوئی فیصلہ نہ ملتا تو مجبوراً خاموش رہتے۔ اس ضرورت کے ماتحت نبی اکرمؐ اور عہدِ صحابہؓ کے احوال و کوائف اور اقوال و اعمال کی جمع و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔

روایات

ان ہی مجموعوں کا نام کتبِ روایات ہے۔ پہلا مجموعہ جو آج ہمارے پاس ہے، موطا امام مالکؒ ہے جو تقریباً سنہ ۱۴۰ھ میں مدون ہوئی۔ اس میں کم و بیش پانچ سو روایات ہوں گی، جو بیشتر احکام ہی پر مشتمل ہیں بنو عباس کے عہدِ حکومت میں، سلطنت بہت وسیع ہو گئی اور تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے نئے نئے مسائل پیش کر دیئے جن کا حل روایات، عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں نہیں مل سکتا تھا اور فقہاء کے لئے یہ بھی مشکل تھا کہ ہر نئے معاملہ میں خاموشی اختیار کر لیں۔ اس ضرورت کے ماتحت روایات وضع ہونی شروع ہوئی اور سو سال کے عرصہ میں (جس..... میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم مدون ہوئی ہیں، یعنی نبی اکرمؐ کے قریب اڑھائی سو سال بعد) ان کی تعداد

اس قدر بڑھ گئی کہ ایک امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے قریباً سات ہزار منتخب کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔

فقہ

لیکن ان کے ساتھ اہلِ فکر کا ایک اور گروہ بھی تھا جس نے ایسے مقامات پر خاموش رہنے یا وضعی روایات کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اس مشکل کا ایک اور حل سوچا۔ ان کے سامنے جب کوئی نیا سوال آتا تو وہ قرآن یا روایات کو سامنے رکھ کر قیاساً استنباط کرتے اور اس طرح اپنی فکر اور رائے سے مسئلہ پیشِ نظر کا حل متعین کر لیتے۔ گروہِ اوّل اہلِ حدیث کے نام سے متعارف ہوا اور گروہِ ثانی اہلِ الرائے یا اہلِ فقہ کہلایا۔ مؤخر الذکر گروہ میں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ بغداد کے قاضی القضاء مقرر ہوئے۔ اُن کی قابلیت اور تفقہ سے ان کی فقہ دولتِ عباسی کا رسمی قانون بن گئی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس فقہ میں اور وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یہی وہ فقہ ہے جو فقہ حنفی کے نام سے متعارف ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ مدت کی مجلسِ شوریٰ اور ان کے منتخب کردہ امام کے تفقہ فی الدین کے اجتماعی فیصلے نہ تھے۔ جو عہدِ اولیٰ میں شریعت کی جزئیات بنتے تھے۔ یہ ائمہ فقہ کے انفرادی تفقہ و تدبر کے نتائج تھے، جنہیں حکومت اپنے مقاصد کے ماتحت بطور قانون رائج کر دیا کرتی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قانون کے محرکات خاص مقاصد و مصالح ہوں تو اس کا اصول سے دُور ہٹ جانا مستبعد نہیں ہوتا..... اس طرح احادیث اور فقہ کے مجموعے مرتب ہوئے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ابھی نصف صدی بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور اس کے بعد اسلام کی گاڑی جس نئی پٹڑی پر ڈال دی گئی اور دینِ خداوندی کا نشہ جس انداز میں بدلا گیا اس کی داستانِ غم ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المناک باب ہے۔ ملوکیت، خدا کے دین میں ایک شجرِ ممنوعہ اور شرفِ انسانی کے لئے ایک جذام کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا سب سے گھناؤنا کردار یہ تھا اور ہمیشہ یہی رہا ہے) کہ سیاسی امور و اختیارات حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور مذہبی معاملات پیشوائیت کے سپرد کر دیئے۔ یہ بعینہٖ عیسائیت کے "قیصر اور کلیسا" کا سا گٹھ جوڑ تھا جس نے دینِ خداوندی کی ناقابلِ تقسیم وحدت کو مذہب اور سیاست کی ثنویت میں بدل دیا۔ سیاست کے، سلاطین کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانے کے بعد، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اسلامی اصولوں کی روشنی میں قوانین مرتب کرنے کا اہم فریضہ انفرادی کوششوں کے سپرد ہو گیا۔ انہی کوششوں کا نام اجتہاد ہے اور ہمارے اسلاف میں جن برگزیدہ شخصیتوں نے اس سلسلے میں کد و کاوش کی وہ اُمت کے امام، فقہا اور مجتہدین کہلائے۔

فقہا میں امام ابوحنیفہؒ کو ملّتِ اسلامیہ میں مقننِ اعظم کا مقام حاصل ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

فقہاء محدثین کے اس گروہ میں جو اُمت میں عقیدت و احترام کا ایک مخصوص مقام رکھتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا اسمِ گرامی سرِفہرست نظر آتا ہے اور ان کے اجتہاد کو اُمت میں صدیوں سے جو امتیازی حیثیت حاصل ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ امام موصوف کو ملّتِ اسلامیہ کے عظیم مقنن کا مقام و منصب حاصل ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ عباسی سلطنت کے زیرِ عتاب تھے اور جیل خانے کی کوٹھڑی میں جان دے دی۔ لیکن جب ان کا جنازہ اُٹھا تو پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان ان کے جنازہ کے ساتھ تھے۔ بغداد کے قاضی شہر حسن بن عمارہ نے اُنہیں غسل دیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ یہ کہتے جا رہے تھے کہ:۔

"واللہ! تم سب سے بڑے فقیہہ، بڑے عابد، بڑے زاہد تھے۔ تم میں تمام خوبیاں موجود تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو اس سے مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں۔"

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمتہ کی عظمت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی کی باضابطہ ترتیب و تدوین کی سب سے پہلی اور مؤثر کوشش کی اور اسی بنا پر انہیں "امام اعظم" کے عظیم القدر خطاب سے نوازا گیا۔ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ان کی فقہ کا مدار قیاس پر تھا اور قیاس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے دین کی جزئیات مرتب کی جائیں اور جو لوگ فقہ اسلامی اور اس کی تاریخ کا علم رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے فقہ کی عظیم الشان ترتیب میں احادیث سے بہت کم مدد لی۔ اس کی وجہ یہ قطعاً نہ تھی کہ امام موصوف کو احادیث نہیں مل سکتی تھیں یا انہیں علمِ حدیث پر عبور حاصل نہیں تھا۔ اگرچہ ان کے مخالفین نے ان پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ احادیث کے معاملہ میں بے بہرہ تھے لیکن یہ الزام افسوسناک مخالفت کا شاخسانہ تھا اور اس کی تردید کرتے ہوئے شمس الائمہ سرخسیؒ نے لکھا تھا کہ:۔

"امام ابوحنیفہؒ کی قلّتِ روایت کی بنا پر بعض مخالفین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ حدیث سے واقف ہی نہیں تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ تو اپنے زمانے کے حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے، لیکن کمالِ ضبط کی شرط ملحوظ رکھتے ہوئے روایت سے بہت کم کام لیتے تھے۔" (کشف الاسرار، جلد دوم صہ ۷۱۸)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام موصوف کی قلّتِ روایت کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ابھی احادیث کے

مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اس دلیل کو بھی غلط قرار دیا ہے چنانچہ اپنے خطبات میں انہوں نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:۔

"یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے موجود نہیں تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے، امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک نہیں پہنچ پائے تھے یا اُن میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے بِن وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ حنفی کے بلند ترین مقنین میں ہوتا ہے۔"

(خطباتِ اقبال ص ۱۶۲-۱۶۳)

خود علامہ محدث امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب "حفاظِ حدیث" اور حافظ ابوالمحاسن ومشقی الشافعی نے اپنی تصنیف "عقود الجمان" میں امام اعظمؒ کو بہت بڑا ماہرِ علمِ حدیث قرار دیا ہے۔ علامہ ابنِ خلدون مع فصل علوم الحدیث" میں لکھتے ہیں:۔

"فنِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا کبارِ مجتہدین میں شمار اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔"

اصل وجہ یہ ہے کہ امام اعظمؒ حدیث کو وحیِ الٰہی کی طرح نہ تو غیر متبدل سمجھتے تھے اور نہ ہی شک وشبہ سے بالاتر۔ ان کے نزدیک دینِ خداوندی کی بنیاد یقینیات پر تھی اور احادیث کو یقینیات کا درجہ حاصل نہیں۔ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورے سے فقہ کی تدوین کرتے تھے اور اگر کوئی یہ اعتراض کرتا کہ آپ کا یہ فیصلہ رسول اللہؐ کی فلاں حدیث کے خلاف ہے تو اُس کے جواب جواب وہ یہی کہتے جو حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ کا وہ فیصلہ اس زمانے کیلئے تھا یا دور کے حالات کے مطابق تھا، اب حالات بدل چکے ہیں اور اسی تبدیلی کی بناء پر فیصلے میں تبدیلی ضروری ہے، یا وہ حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ کبارؓ کے اتباع میں یہ کہتے کہ کیا معلوم رسول اللہؐ نے کیا فرمایا تھا اور

سننے والے نے اسے کیا سمجھا! ہم کتاب اللہ کی موجودگی میں غیر یقینی چیزوں کو دین کا حصّہ نہیں قرار دے سکتے۔ چونکہ وہ اس حقیقت کو واضح اور نمایاں کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ احادیثِ رسول اللہؐ نہ تو یقینی ہیں اور نہ غیر متبدّل، اس لئے احادیث کے ردّ میں وہ بعض اوقات شدّت بھی اختیار کر لیتے تھے۔

یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "وضو آدھا ایمان ہے" ابو حنیفہؒ کہنے لگے پھر تو دو وضو کر ڈالو تاکہ تمہارا ایمان مکمل ہو جائے۔ اسی طرح ان کے سامنے یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ "لَا اَدْرِیْ" (میں نہیں جانتا) کہہ دینا آدھا علم ہے۔ ابو حنیفہؒ کہنے لگے کہ بس دو مرتبہ لا ادری کہہ دینا چاہیئے تاکہ علم مکمل ہو جائے۔

یہ تھا فقہ اسلامی کے اس امام اعظمؒ کا احادیث کے بارے میں مسلک۔ امام اعظمؒ نے اس مسلک کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "خود رسول اللہؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جزئیاتِ دین کی تعیین میں آپؐ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جو رائے بہتر ہوتی اسے اختیار فرما لیا کرتے تھے"۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "اگر میں رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تو میں بھی اس مجلسِ مشاورت میں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری ذاتی رائے کو اختیار فرما لیتے"۔

اس مقام پر ایک اور اہم حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ امام اعظمؒ کا منشاء یہ نہ تھا کہ وہ اپنی فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدّل سمجھتے تھے جیسا کہ ان کے بعد فقہ حنفی کی تقلید کرنے والوں نے سمجھ لیا۔ جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ صدرِ اوّل کے فیصلے بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدّل قرار نہیں پا سکتے، وہ اپنے تفقّہ و اجتہاد کو کیونکر غیر متبدّل اور ہمیشہ کے لئے واجبِ تقلید قرار دے سکتا ہے! اس باب میں تاریخی شواہد موجود ہیں کہ امام اعظمؒ نے اسے قطعاً پسند نہیں کیا کہ ان کے اجتہادات کو ابدی حیثیت دے دی جائے۔

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ امام اعظمؒ نے اپنے اجتہاد کے بارے میں یہ کچھ تصریحات فرمائیں اور اس کے بعد وہ کروڑوں انسان جنہوں نے فقہ حنفی کو اپنا کر انہیں اپنا امام تسلیم کیا، وہ اس عقیدہ پر جم گئے کہ فقہ حنفی کی حیثیت غیر متبدّل ہے..... معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھا اور یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ آیاتِ قرآنی کی وہی تفسیر قابلِ قبول سمجھی جائے گی جو فقہ حنفی سے مطابقت رکھتی ہو..... فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام، ابو الحسن عبید اللہ الکرخیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ:-

"ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا مُاوّل تھے یا منسوخ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مُاوّل ہے یا منسوخ ہے"

(تاریخ التشریح الاسلامی۔ مؤلفہ علامہ محمد الخضری کا اردو ترجمہ "تاریخ فقہ اسلامی")

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اس وقت تک کے دیئے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام فقۂ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ امام ابوحنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہاء کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔

ابوزہرا فقۂ حنفی کے اس افسوسناک انجام کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"بدقسمتی کی بات ہے کہ متأخرین نے اس دروازے کو بند کر دیا۔ اور اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی کام نہ رہ گیا کہ ترجیح شدہ اقوال و آراء کو سامنے رکھ کر فتوے دے دیا کریں۔ اب یہ اس کے مجاز نہیں رہ گئے کہ جن مسائل میں کوئی نص موجود نہیں ہے ان پر اجتہاد کر کے کوئی رائے قائم کر سکیں۔ ان کے نزدیک مذہب مدون ہو چکا، کتابیں مرتب ہو چکیں، لہٰذا ہر حنفی پر واجب ہے کہ آنکھ بند کر کے تقلید کرتا چلا جائے"۔ (امام ابوحنیفہؒ ص ۷۰۲)

علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے خطبات میں اس افسوسناک صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی رُوح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلے میں نافذ ہوئے"۔

(خطباتِ اقبال۔ اسلامی قانون شریعت میں اصول ارتقاء)

اس افسوسناک روش پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:۔

سچ پوچھئے تو امام اعظمؒ اور ان کے رفقائے جلیل کی عظیم الشان اجتہادی کاوشیں ہمارے لئے اس مرحلے پر نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان پہلے دن سے اسلامی قوانین کی ازسرِ نو تشکیل کی اہم ضرورت سے دوچار ہے۔ ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ اس راہ میں ایک مستقل روک بن کر کھڑا ہے۔ اپنی قدامت پسندی اور تفرقہ بازی کے باعث وہ نہ خود اس کا کوئی متفق علیہ حل پیش کرنے کے قابل ہے اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان حالات میں اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کرنے کی واحد صورت وہی ہے جس کی نشاندہی امام اعظمؒ نے فرمائی تھی اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی پابندی اختیار کرتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین کی تشکیل باہمی مشاورت سے عمل میں لائی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ قدامت پرستی کے شور و شر

کے پیشِ نظر یہ راہ اختیار کرنے میں بڑی جرأت اور ہمت درکار ہے لیکن ایسا کئے بغیر ہم ایک قدم بھی کامیابی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ علامہ اقبالؒ اسی سلسلۂ تفصیل میں لکھتے ہیں :-

"مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق صغیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابل ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔"

(خطباتِ اقبال ص۱۵۶)

اس سلسلے میں انہوں نے مزید بتایا کہ :-

"میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس JURIS PRUDENCE پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام میں مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن بھی..... افسوس کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔ میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔"

(اقبال نامہ جلد اوّل ص۵۰)

لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ وقت اب یقیناً آگیا ہے جس کے متعلق علامہ مرحوم نے اپنے خطبات میں پیشین گوئی کی تھی کہ :-

"یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی صدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ حسبنا کتاب اللہ"

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خطبہ کے اختتام پر فرمایا تھا کہ :-

"اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بناء پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختم نبوت کے) بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے، لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے، لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔"

ارضِ پاکستان اس انتظار میں ہے کہ پھر کوئی عمر فاروقؓ، امام اعظمؒ اور اقبالؒ کی روح کو لے کر اُٹھے اور قانون سازی کے سلسلے میں اس مملکت کو اس طلسمِ پیچ وتاب سے نجات دلائے جس میں یہ بدقسمتی سے اکتالیس سال سے بُری طرح گرفتار چلی آرہی ہے اور جس سے نکلنے کی ابھی بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

بقیہ حقائق وعبر از صفحہ ۷۳

تھے۔

۱۰۔ علماء کرام نے بڑی فیاضی سے روشن خیالی کو بے دینی، فقہی اختلاف کو کفر، جمودِ فکری و ذہنی کو عین دین معاشرتی معاملات میں دلچسپی کو دنیاداری، اجتہاد کو گمراہی، ہر فروعی اختلاف کو اصولِ دین، معاشی انصاف کی بات کو مذہب بیزاری تعصب کو کارِ ثواب ہر دوسرے عالم کو گردن زدنی ہر دوسری مسجد کو مندر اور گوردوارہ، کلمہ و کعبہ سے لے کر مونچھ کے بال تک میں اختلاف کو دین کا بنیادی تقاضا قرار دیا جس کے ردِ عمل میں عوام نے سرد مہری اور بے رخی برتی اب علماء خود اس راہ پر چل نکلنے کو بے تاب ہیں جس پر چلنے سے کبھی وہ روکا کرتے تھے۔

(سید خورشید احمد گیلانی ہفت روزہ چٹان۔ بابت ۱۹ جولائی ۱۹۸۸ء صفحات ۱۸، ۱۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

۱۔ فرقہ اہلحدیث اور درود کی صحیح عبارت

کچھ عرصہ پہلے فرقہ اہل حدیث کے اخبارات و رسائل میں درود کی وہ عبارت شائع ہوتی تھی، جو ایک ایسے فرقے کی طرف سے رائج کی گئی تھی جو آلِ رسولؐ کو ذاتِ رسولؐ کا ایک حصہ تصور کرتا تھا۔ بلکہ اس میں سے بعض آلِ رسول کو آپؐ کی نبوت میں بھی شریک قرار دیتا تھا۔ عربی گرائمر کی رُو سے یہ عبارت غلط تھی اور عربی گرائمر کے امام سیبویہ نحوی نے اس کے استعمال کو نہ صرف غلط بلکہ سخت معیوب قرار دیا تھا۔ ان حضرات نے اپنے اخبارات و رسائل میں درود کی عبارت تو ٹھیک کر لی۔ لیکن چونکہ علمی طور پر ان کی سبکی ہوئی تھی اس لئے اس بارے میں کٹ حجتی بھی جاری رکھی۔ اور اس بارے میں ایسی دلیل دی کہ جس سے خود قرآن مجید کی محکمیت متاثر ہوئی۔ اس بارے میں اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ حضرات ماہنامہ محدث کی اشاعت میں طلوع اسلام پر یوں برستے ہیں:۔

> ہم بڑے ادب و احترام سے آپ کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ جب بھی کبھی اپنے آپ کو علمی برتری کے گھمنڈ میں مبتلا پائیں تو اس کے ازالہ کے لئے اس نحوی قاعدے سے متعلق محدث کے مذکورہ شمارے ضرور ملاحظہ فرمالیا کریں ـــــ یوں آپ کو اپنا مبلغ علم بھی معلوم ہو جایا کرے گا اور کسی مجموعہ حدیث سے درود کے زیر بحث الفاظ کی مثال بھی طلب کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی، جیسے کہ آپ نے لکھا ہے۔
>
> "ہمارا سوال یہ تھا کہ اگر "آلِہٖ" کے اضافے والے درود کی عبارت صحیح ہے۔۔۔۔ تو پھر حدیث کے ۴۷ مجموعوں میں درج شدہ احادیث کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے"!
>
> (طلوع اسلام جنوری ۸۷ء)

جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آلہٖ کے اضافے کے ساتھ درود کی عبارت اگر حدیث کے کسی مجموعے میں نہ بھی ہو، تب بھی حدیث کی کسی کتاب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا ـــــ بالکل ویسے

ہی جیسے کہ آلِ کے اضافے کے بغیر صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآنِ کریم میں کہیں بھی موجود نہ ہونے سے قرآنِ پاک پر کوئی حرف نہیں آتا! ——— ہم طلوع اسلام سے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جب ہم نے ضمیر مجرور پر حرف جر دُہرائے بغیر اسم ظاہر کے عطف کا جواز ثابت کر دیا ہے، تو اس کے بعد بھی بھکاری کا کشکول اُٹھا کر درود کے الفاظ کی مثال کے لئے دستِ سوال دراز کرنا کیا عبث اور لایعنی حرکت نہیں"؟

قرآن مجید میں سورۃ النساء کے شروع میں ایک لفظ 'اَرْحَام' ہے اور قرآن مجید کے جس نسخے پر اُمّتِ مسلمہ کا اتفاق ہے اس میں یہ لفظ 'م' کے زبر کے ساتھ ہے۔ لیکن جس فرقے نے درود کی غلط عبارت کہ جسے عربی لغت و نحو کے تمام ائمہ رد کر چکے تھے' کا جواز ثابت کرنے کے لئے 'ارحام' کی ایک غیر معروف قرأت کا حوالہ دیا کہ اس میں 'م' کے نیچے زیر ہے اور اس کے بارے میں ایک ضعیف حدیث کے سہارے یہ اعلان فرمایا کہ یہ قرأت رسول اللہ صلعم سے منقول ہے اور جو اسے رد کرے گا اس نے گویا رسول اللہ کو رد کیا۔ (ایضاً صفحہ ۴۳ / ۴۱۱) اس کمزور حدیث کے حوالے سے اتنی بڑی بات منہ سے نکالتے وقت، ان نیم تعلیم یافتہ متحدث حضرات کو اس امر کا احساس تک بھی نہ ہوا کہ اس قرأت کو عرب لغت و نحو کے تمام ائمہ اور خود اُمّتِ مسلمہ رد کر چکی ہے۔ اور اس وقت قرآن میں اس لفظ کی صحیح قرأت 'اَلْاَرْحَامَ' ہی ہے۔ تو ان کی اس لایعنی منطق کے مطابق کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربی لغت و گرائمر اور اُمّتِ مسلمہ نے متفقہ طور پر نعوذ باللہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رد کر دیا ہے۔ خدارا اپنی جہالت کو چھپانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر تو کیچڑ نہ اُچھالیے!

۲۔ عوام کی دین سے بے رغبتی

موجودہ دور کے مسلمان، جس طرح دینِ اسلام سے دن بدن دُور ہوتے جاتے ہیں اس کے بارے میں اب خود قدامت پسند علماء تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اس کے کسی حد تک قصوروار خود علماء ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس کی تائید میں تبلیغی جماعت کے بانی محترم محمد الیاس صاحب کی یہ تحریر پیش کرتے ہیں:

"ہم سمجھ رہے ہیں کہ جگہ جگہ مدارسِ دینیہ کا قائم ہونا، علماء کا وعظ و نصیحت کرنا خانقاہوں کا آباد ہونا، مذہبی کتابوں کا تصنیف ہونا، رسالوں کا جاری ہونا، یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شعبے ہیں اور ان کے ذریعے اس فریضہ کی ادائیگی ہو رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان سب اداروں کا قیام اور بقا بہت ضروری ہے اور ان کی جانب اعتناء اہم امور سے ہے اس لیئے کہ

دین کی جو کچھ تھوڑی بہت جھلک دکھائی دے رہی ہے وہ انہی اداروں کے مبارک آثار ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری موجودہ ضرورت کے لئے یہ ادارے کافی نہیں اور ان پر اکتفاء کرنا ہماری کھلی غلطی ہے اس لئے کہ ان اداروں سے ہم اس وقت منتفع ہو سکتے ہیں جب ہم میں دین کا شوق اور طلب ہو اور مذہب کی وقعت اور عظمت ہو۔ اب سے پچاس سال پہلے ہم میں طلب اور شوق موجود تھا اور ایمانی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لئے ان اداروں کا قیام ہمارے لئے کافی تھا لیکن آج غیر اقوام کی انتھک کوششوں نے ہمارے اسلامی جذبات بالکل فنا کر دیئے اور طلب و رغبت کی بجائے آج ہم مذہب سے متنفر اور بیزار نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم مستقل کوئی ایسی تحریک شروع کریں جس سے عوام میں دین کے ساتھ تعلق اور شوق و رغبت پیدا ہو۔ اور ان کے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہوں۔ پھر ہم ان اداروں سے ان کی شان کے مطابق منتفع ہو سکتے ہیں ورنہ اسی طرح دین سے بے رغبتی اور بے اعتنائی بڑھتی گئی تو ان اداروں سے انتفاع تو درکنار ان کی بقا بھی دشوار نظر آتی ہے۔" (ماہنامہ میثاق بابت مارچ ۸۸ء، ص ۵۶ تا ۵۷)

ڈاکٹر صاحب اصل حقیقت جان لینے کے باوجود، دوسرے علماء کی مبہم تحریروں کا سہارا لے رہے ہیں۔ اگر ان میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ خود بھی اس حقیقت کا واشگاف اعلان کرتے کہ ہماری نئی نسل کو نیم تعلیم یافتہ مولوی حضرات کی غلط سلط تعبیروں ہی نے تو اسلام سے دور کر دیا ہے!

۳۔ علماء کے بارے میں عوام کیا سوچتے ہیں؟

طبقہ علماء ہی کے ایک فرد نے علماء کے بارے میں عوام کے خیالات معلوم کر کے انہیں ایک مضمون کی شکل میں ہفت روزہ چٹان میں شائع کرایا ہے۔ طلوعِ اسلام ان حضرات کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا تھا تو اسے گردن زدنی کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اب انہوں نے خود اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ جسے قارئین طلوعِ اسلام کی دلچسپی کے لئے معاصر چٹان سے نقل کیا جاتا ہے:۔

۱۔ ہم اس گئے گزرے دور میں بھی جس حد تک ممکن ہے۔ علماء کی کفالت کرتے ہیں۔ خواہ تنخواہ کی شکل میں ہو یا نذرانوں کی صورت میں، اور بعض اوقات ایک ایک تقریر کا ہم اتنا معاوضہ دیتے ہیں جو بالعموم کسی کمانے والے کی مہینہ بھر کی کمائی کے برابر ہوتا ہے یا میں ہمہ دین

کی حقیقی تبلیغ کے معاملے میں علماء کا کردار قابل رشک نہیں۔ یہ اللہ و رسولؐ کے احکام و تعلیمات کا کرشمہ ہے کہ دین اب بھی معاشرے میں غالب حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ مسجدوں اور مدرسوں سے یہی وہ کچھ نہیں ملتا جس کی توقع ہوتی ہے۔

۲۔ درس و تدریس کا ماحول ہو یا تقریر و تحریر کا، علماء کرام نے ہمیشہ اپنے اپنے فرقے کے لوگ تیار کئے ہیں۔ حقیقی معنوں میں مبلغ اسلام پیدا نہیں ہوئے۔ جس کے نتیجے میں فرقہ واریت روز افزوں ہے۔ اور آئے روز مسجدوں کے بٹوارے ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے جہاں دین کا تقدس مجروح ہو رہا ہے وہاں خود علماء کا وقار بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔

۳۔ علماء نے جس بڑی تعداد میں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر کفر، ارتداد، گمراہی، اور نکاح ٹوٹنے کے فتوے جاری کئے ہیں، اس سے ایک طرف دین بازیچۂ اطفال لگنے لگا اور دوسری طرف لوگوں میں ایک طرح کی بیزاری اور بغاوت کے رجحانات پیدا ہو گئے، جس سے علماء اور عوام کے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔

۴۔ عوام تو آج بھی علماء کی عزت کرتے ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتے، ان کے خلاف دو زانو ہو کر بیٹھتے اور پس پشت بھی احترام سے نام لیتے ہیں۔ لیکن علماء اپنی تقریروں اور خطبات جمعہ میں اپنے سے مختلف مسلک کے علماء کے بارے میں جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ تو شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے دوسرے کی پگڑی اچھل رہی ہے جب کہ حقیقت میں عوام مجموعی طور پر علماء کی ذات سے وحشت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

۵۔ عوام اگرچہ آج بھی مسجد، عیدگاہ، نماز جنازہ، خطبہ، جمعہ اور مختلف مواقع پر علماء کو بلاتے اور ان سے اللہ اور رسولؐ کی باتیں سنتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے علماء نے کبھی اپنے معیار کا خیال نہیں رکھا چنانچہ بعض اوقات ایسے لب و لہجے ایسے انداز، ایسی کے اور ایسی معلومات پر مبنی تقریر ہوتی ہے کہ اہل دانش تو خیر بچے تک اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکتے، ایسے میں علماء کا وقار قائم رہے تو کیسے رہے؟

۶۔ علماء کی یہ شکایت بجا ہے کہ انہیں کونسلوں، اسمبلیوں اور دیگر اداروں کی نمائندگی کے موقع پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن اس میں بھی علماء کے رویے کا کچھ نہ کچھ دخل ہے مثلاً مختلف مسلک کے علماء کی بول چال اور علیک سلیک بالعموم بند ہوتی ہے، علماء جنازہ اس وقت پڑھنے آتے ہیں۔ جب انہوں نے پڑھانا ہو۔ نمازیں تب مسجد میں آکر پڑھتے

ہیں جب انہیں امامت کرانی ہو اب اس چھوٹی سی ٹولی اور اپنی ذات کے خول میں
بند رہنے سے کیسے ممکن ہے کہ عوام انہیں مختلف اداروں اور اسمبلیوں میں بھیجیں جہاں
رواداری، طبعی وسعت اور ہر معاملہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے
ان کے مزاج میں ہر دوسری بات پر کفر کا فتویٰ اور ذرا سی "گستاخی" پر بول چال بند
کر دینے کے عناصر شامل ہیں جبکہ اسمبلیاں اور ادارے ایسے مزاج والوں اور ایسے
مزاج والوں کے لئے یہ ادارے ناموزوں ہوتے ہیں۔

۷۔ علماء کرام نور البشر، حاضر ناظر، علم تعزیہ، خلافت امامت رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسائل سے فارغ ہوں اور معاشرتی حالات کو زیر بحث لائیں تب عوام کو بھی معلوم ہو گا کہ یہ لوگ واقع حالات کی رفتار کو سمجھتے اور معاملات کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں ورنہ ان مسائل کے لئے تو ایوان اور اسمبلیاں نہیں ہوتیں جب علماء اخبارات و رسائل پڑھنے کو اپنی توہین سمجھتے، مصنفین لکھنے کی صلاحیت سے بے عاری، قومی و ملکی حالات سے قطعاً الگ تھلگ اور تقاریر میں چھبتے اور سلگتے مسائل پر گفتگو کو دنیا داری قرار دیں تو عوام انہیں ووٹ کس بنیاد پر دیں۔

۸۔ بلاشبہ علماء کے ایک حصے کا کردار نہایت قابل رشک و قابل تصور رہا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر علماء حکومتوں کی گرانٹ کے خواہاں، اسلام اور جمہوریت دشمن سرمایہ داروں کے حاشیہ نشین، انقلابی کارکنوں سے نفرت کرنے والے، سیاسی جدوجہد کو بغاوت اور بے دینی قرار دینے والے، ہر اہم قومی مسئلہ پر اختلاف اور افتراق پیدا کرنے والے اور مختلف مواقع پر فقہی موشگافیوں کا سہارا لے کر جابر حکومتوں کو سہارا دینے والے بنے رہے اور سلاطین و ملوک اور نام نہاد خلفاء ان کے فتوؤں کی بنیاد پر اہل حق کو کوڑے مارتے سزائیں دیتے، ملک بدر کرتے اور جام شہادت نوش کراتے ہوئے انہی فقہی موشگافیوں نے جابر و آمر حکمرانوں کے اقتدار کو پایۂ جواز عطا کیا۔

۹۔ سیاسی و معاشرتی جدوجہد کے ہر آخری موڑ پر علماء نے مسلکی تعصب اور فرقہ وارانہ مزاج کا مظاہرہ کیا اور نازک مواقع پر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر کے قومی وحدت اور شیرازہ کو تار تار کر کے رکھ دیا اور ارباب اقتدار کو ایک اور بہانہ جبر روا رکھنے کا میسر آگیا جس کے نتیجے میں منزل انہیں مل گئی جو واقعی شریک سفر نہ

(بقیہ صفحہ ۶۸ پر)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقد و نظر

نام کتاب - قبلۂ اوّل
مصنّف - حسن عبّاس رضوی (مرحوم)
ناشر - بیگم حسن عبّاس رضوی
صفحات - ۱۱۰
قیمت - -/۳۵ روپے
طبع کردہ - النور پرنٹرز و پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۴۱۹۰، لاہور۔ ۳۵
عمدہ طباعت، دیدہ زیب سرورق - سفید آفسٹ کاغذ۔

ہمارے ہاں یہ مفروضہ ایک مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ بیت المقدّس مسلمانوں کا قبلۂ اوّل تھا۔ مصنّف اس کتاب میں پہلے مسلمانوں کو قبلہ کی اہمیّت سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس کی حیثیّت مرکزِ ملّت کی ہوتی ہے۔ اور قرآنِ مجید کی واضح تعلیمات کے مطابق اتّباعِ قبلہ سے مُراد اتّباعِ دین ہے (صفحہ ۲)۔ اس کے بعد، وہ قرآنِ مجید ہی کی بیشتر آیات کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ نہ صرف یہ کہ شروع ہی سے مسلمانوں کا قبلہ رہا ہے۔ بلکہ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا بھی قبلہ رہا ہے۔ بیت المقدس کی حیثیت ایک مقامی عبادت گاہ کی رہی ہے۔ جسے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السّلام نے تعمیر کیا تھا۔ جو کہ بہت بعد کی بات ہے۔ قرآنِ مجید اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اس مقام کو کبھی بھی انسانوں کا مرکز قرار نہیں دیا گیا تھا۔ (صفحہ ۱۷)

اس کے بعد، مصنّف قرآنِ مجید کی مختلف آیات کی تعریف سے یہ ثابت کرتے ہیں، کہ خانہ کعبہ، اسلام سے بھی پہلے عربوں کے لیے قبلہ کی حیثیت رکھتا تھا قبلہ کا تعلّق بنیادی طور پر حج سے رہا ہے۔ اور نہ تو کبھی عربوں نے اور نہ ہی مسلمانوں نے بیت المقدس کا حج کیا تھا۔ (صفحہ ۸) نبی بنائے جانے کے بعد، رسول اللہ صلّی علیہ وسلّم مکّہ مکرّمہ میں خانہ کعبہ ہی کیطرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ قرآنِ مجید میں اس امر کا کہیں ذکر نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کسی وقت مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی بجائے، بیت المقدس کو بطور قبلہ اپنانے کے لیے کہا ہو۔ بلکہ آپ

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

and uncultured though educated (in the light of Syed Ahmed's understanding of the terms "educated" and "cultured") men is resulting in unhappy and broken homes. Used as he was to an "enslaved prostitute" for a wife the husband cannot recognise the new woman-dignified, assertive and rational-and attempts to break her into the old image and old pattern of life with which he is familiar. But now many women have an alternative: they can live and survive as unmarried or divorced women.

However, one riddle still remains: In order to put foreward this point of view why did Syed Ahmed think it necessary to describe modern western books as "unholy and useless" for women, when he regarded them as a precondition to education and progress for men? And why did he have to describe traditional oriental books as "beneficial" for women, when he had already described them as irrational and nonsensical, study of which was "like stuffing a dummy?"

KINDLY NOTE THAT THIS IS THE LAST INSTALMENT APPEARING IN THIS MONTHLY. BEFORE THE NEXT ISSUE IS OUT, THE BOOK ' SIR SYED AHMAD KHAN AS AN EDUCATIONIST ' WILL BE AVAILABLE FOR S A L E .

"RIGHTS OF WOMEN IN ISLAM"
BY
PROF: RAFI-UL-LAH SHEHAB
NOW AVAILABLE FROM THE SALE DEPOT
OF TOLU-E-ISLAM TRUST, 25-B, GULBERG-2,
LAHORE - PAKISTAN.

literature and science, as a great lover of knowledge and with tremendous intellectual curiosity, to tell the Muslim women of India that they should not read the "useless and unholy" books of the modern times but rather cling to the material that their grandmothers read, is indeed incomprehensible. The girls may not go to schools, they may not take up jobs, they may even postpone their basic formal education, but what is the harm in reading western arts and literature privately at home with the help of their fathers and brothers? This would have remained an enigma had it not been for a letter that he wrote to a friend, Mumtaz Ali, preserved in a collection of his correspondence with different people. It is worth quoting the letter at length: "It is my sincere desire that women should receive excellent and high education. But in the present conditions to educate unmarried women is to inflict cruelty upon them and submerge them into life-long grief, bristling with problems. As unmarried women they cannot live and survive in our society, hence they have to get married. It is all too evident that our boys are corrupt, evil in habits and actions, treating their wives in a most immoral manner. These days there is not a single boy even in our respectable families who is well-behaved, pleasant in manners, educated and cultured, who would consider his wife a loving and sympathetic companion. Boys look upon their wives to be lower than enslaved prostitutes and there is hardly a vice that they do not commit against them. Now such a treatment is meted out to women who are themselves uncultivated. They are themselves devoid of that finer intellect and culture, and regard their husband's ill treatment of them as part of the general misery of life. They feel consoled by the knowledge that all women are sailing in the same boat. But if she becomes sophisticated and cultured and highly intellectual, all this would become a soul-searing experience. To educate women before men become cultivated human beings is undesirable and a torture for the women. A sophisticated and cultured man does not suffer as much if his wife is uncultured. Through affection he can civilise his wife. There are several such cases in my family. Thus women should be kept in such a condition that if they get cultured husbands they can be transformed into good companions; if not, they can remain as uncultured as their husbands."[20] His objective was to preserve the basic social unit a harmonious family life. On no account should this disintegrate, at least not when the nation was already falling apart. If the risk is taken it should be only when women could survive in the society as unmarried women. The profound psychological understanding and penetrating farsightedness that he manifested is indeed remarkable. The situation that he feared in the nineteenth century became a reality in the twentieth century when women did start acquiring modern western education in fairly large numbers. The terrible misery wrought by marriages between educated and cultivated women

20 "Maktubat-e-Sir Syed" page 380.

opening more Government schools for girls. What actually surprises more than anything else is that he urged the women to retain and revive the old method of education. He described in detail more than once as to how a respectable home in a locality was selected as the place where the girls of the area would assemble and study from a respectable lady, a grandmother or an aunt or some elderly relative. He wanted this system to survive, which could be acceptable, but he wanted them to read "the books that your grandmothers read. These were beneficial then, and they are beneficial now. You have no need to read the useless and unholy books of today."[13] It is the old books that will make you "good-hearted, sympathetic and loving....devout, upright and good neighbourly."[14] He justified this on the basis that socio-economic conditions had not changed for women. She must continue to be a good and efficient housewife and mother. Since the conditions for men had changed "they had to acquire some kind of knowledge and learn some language for the sake of earning bread. But this necessity does not arise for you, so you can continue as of yore."[15] Comparing with conditions in Europe and America he said that women there have to be "so educated that they can become postmasters, telephone operators and members of parliament. But such conditions do not prevail in India and perhaps never will for centuries."[16] Of course this forecast of his was disproved. Within decades Indian women were following their counterparts in the West. Perhaps it could not be visualised in the nineteenth century that time would move so fast and the needs of the society develop so speedily. However, it was not the careers and jobs for women that were important. From Syed Ahmed's own point of view even men were warned not to be mere "worshippers of the stomach", but to develop their inner potentials and become better human beings, and to acquire knowledge for the sake of knowledge. This beautiful experience Syed Ahmed was denying to women. He objected to a girl reading 'Tuzkai-Jahangiri'[17] with the help of her father at home. He also could not see any reason why any girl should read the geography of Africa and America, the history of Ahmed Shah and Muhammaed Shah and the Mayarhtta wars, and study Algebra and Trignometry![18] Of what use was this, he asked. He also wondered why a Parsi girl felt the need to read and write the English language![19] All this sounds very contradictory to what Syed Ahmed stood for all his life. It goes against his basic educational policy. As a champion of and an enthusiastic admirer of western

13 Ibid page 144.
14 Ibid page 144.
15 Ibid page 144.
16 Khutbat-e-Sir Syed - Vol: II pages 64-65.
17 Emperor Jahangir's Autobiography.
18 Khutbat-e-Sir Syed - Vol: II pages 65-66.
19 "Musafiran-e-London" page 52.

is no nation in the world when men's condition had improved and then women's did not. These facts have effected me a great deal. All the efforts that I have made for the education of boys must not make you think that I have forgotten the girls. I am convinced that education for boys is a guarantee of girls' education. Thus whatever service I am doing for boys is in reality service to both."[9] He reiterated this stand of his in 1891 in Aligarh saying that the "education for the boys today is in reality the education for the girls whose fathers they will be."[10] No doubt this is a very realistic and farsighted view to take. These are the qualities that Syed Ahmed manifested on several occasions - his policy of reconciliation with the British, his aloofness from practical politics and his complete detatchment from the religious instruction in the M.A.O. College. The universal male dominance and the economic dependence of the women on men have made the women helpless in taking any initiative. They have to wait until men can approve. This kind of a situation is not at all uncommon in developing societies including Europe, so it is wrong to surmise that Syed Ahmed was against women's education. He only wanted to postpone it for better and more congenial days. Hadi Hussain remarks that "he wanted it to come, not by forced marches, but in the natural course of events, as the next stage of the social and economic advancement of the Muslims and as a logical outcome of it. "[11] So far so good. But it may also be pointed out that although it helps women's education if men are already educated, most of the human rights, including the right to education, is not that easily bestowed upon them. The history of suffragette movement in England in the nineteenth century and the present day Women's Liberation Movement in the West go to prove that rights are extracted from the dominant party, hardly ever given as a gift. The history of his own people prove the same thing. Moreover, the uncultured atmosphere that Syed Ahmed wanted women to be saved from could be, to a very great degree the creation of women themselves. This was in fact pointed out by the "women of the Punjab" in their address to him as the "wrong upbringing of little children because of the uneducated women".[12] Most of the disrespect shown by men to women is because women themselves have no self-respect and as mothers they have failed to improve the cultural tone of the society even seventy-two years after Syed Ahmed's death. Not only this: Today they are regarded as the main obstacle and the most conservative element (apart from the Ulema) in upholding the wasteful customs that he so rightly condemned. So one wonders about his priorities. Still, there is undeniably a great deal of realism and sincerety in his approach. One can accept his priorities and the fact that the atmosphere was most unfavourable to

9 "Safarnama Punjab" page 144.
10 Khutbat-e-Sir Syed - Vol: II page 223.
11 Hadi Hussain "Syed Ahmed Khan" page 216.
12 "Safarnama Punjab" page 140.

disappointment to many when he struck a different note regarding the education of Muslim Women in India during the proceedings of the Education Commission in 1882. The questin raised was: what could the Government do in organishing education for women, and how far would these efforts be successful? Syed Ahmed's categorical answer was against any such plans, and in favour of the status quo. Since he expressed this view twelve years after his visit to Europe, it must be regarded as a well thought out one. He seemed to think that the contrast between the conditions and atmosphere of Europe and India was too great. India was too uncultured, too barbaric and too ignorant to appreciate women's education. "If women were educated now and not twentyfive years later, it would be untimely and ineffective."6 No wonder that he thought that the state of Government schools was not at all conducive to encourage parents to send their daughters to study there. He said that if Europeans were properly acquainted with these conditions, they would not blame the parents. In the uncultured background of the country one does not know "what atmosphere it (the school) has, what kind of girls assemble there, and what kind of teachers teach there and what kind of life they lead.7 So his suggestion to the Education Commission was that the "Government at present aught to concentrate its efforts in adopting measures for the education and enlightenment of Muhammadan boys. When the present generation of Muhammadan men is well educated and enlightened, the circumstances will necessarily have a powerful though indirect effect on the enlightenment of Muhammadan women, for enlightened fathers, brothers and husbands will naturally be most anxious to educate their female relations. Any endeavours on the part of Government to introduce female education among Muhammadans will, under the present social circumstances, prove a complete failure so far as respectable families are concerned, and in my humble opinion, will probably produce mischievous results, and be a waste of money and energy. "8 This was the first time that Syed Ahmed spelled out his theory of priorities, of educating men, at least one generation of them, before educating the women. Even so, his point of view caused confusion, coming as it did from him as one of the greatest exponents of modern western education in India. The impression created was that he was against women's education. Hence in 1884, (two years after the Education Commission) when he made a province-wide tour of the Punjab, the "women of the Punjab" presented an address to him in Gurdaspur. In answer to it he assured the women that he sincerely desired their education, but to acquire it at this stage was impracticable. Elaborating his statement made before the Commission he said, "There is no nation in the world where women have been able to improve their condition before men improved theirs. And there

6 Khutbat-e-Sir Syed - Vol: I pages 126-127.
7 Ibid Volume II page 279.
8 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" pages 297-298.

CHAPTER VIII

WOMEN'S EDUCATION

Syed Ahmed had definite views on the education of Muslim women in India, and therefore it deserves a separate treatment.

Some of his earliest comments of the education of women in general were made in his Travel Journal from London. We have already observed that Syed Ahmed was higly impressed by the western civilisation during his visit to Europe. He attributed all this to the general spread of education among both women and men.[1] He made a particular reference to his landlady, Mrs. Ludlum and her two sisters, Allen and Fanny West. He described Mrs. Ludlum as a highly sophisticated and educated lady. Miss Allen West was very fond of reading. Once when bedridden with illness, she borrowed a serious religious book from Syed Ahmed and later discussed its salient points with him. He could not get over the fact that she should spend her time thus while ill. The Travel Journal also records his extreme envy when he saw a maidservant reading her daily newspaper.[2] His admiration knew no bounds when he met a woman managing the instruments in an observatory at Mount St. Vincent in Clifton. She skilfully demonstratred to all visitors who came to see these instruments. He wondered if the "Ulema, the philosophers and the logicians (back home in India) would feel ashamed of themselves at seeing a woman managing the factory. "[3] Then he very approvingly expressed the surprise of these English women that the Indian women should be devoid of education. They were right, he said, in looking down upon them with contempt and dislike. Indeed, it was with great anguish and envy that Syed Ahmed compared the English women with their counterparts in India.[4]

Thus from these comments it is obvious that Syed Ahmed stood in favour of women's education. Accordingly, he had a word of praise for those Egyptian women as well who were struggling to acquire education. He especially took note of a girl who apart from being well-versed in Arabic, her own mother-tongue, was also acquainted with the French language and little bit of Latin.[5]

Knowing Syed Ahmed's views to be such, it came as a surprise and a

1 Musafiran-e-London" page 186.
2 Ibid pages 194-195.
3 Ibid page 176.
4 Ibid pages 188-189.
5 Ibid pages 193-194.